ربیع الاوّل ۱۴۳۵ھ

جنوری ۲۰۱۴ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات

تنظیمِ اسلامی

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تقویٰ اور اُس کی عملی شکلیں

”اربعینِ نوویؒ“ کی ایک حدیث کی تفہیم

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

داعی رجوع الی القرآن ٭ بانی تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

حصہ اول سورۃ الفاتحہ وسورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن

(آٹھواں ایڈیشن) ——— صفحات:360، قیمت 450 روپے

حصہ دوم سورۃ آلِ عمران تا سورۃ المائدہ

(چھٹا ایڈیشن) ——— صفحات 321، قیمت 425 روپے

حصہ سوم سورۃ الانعام تا سورۃ التوبہ

(چوتھا ایڈیشن) ——— صفحات 331، قیمت 425 روپے

حصہ چہارم سورۃ یُونس تا سورۃ الکہف

(تیسرا ایڈیشن) ——— صفحات 394، قیمت 460 روپے

حصہ پنجم سُورۃ مریم تا سُورۃ السّجدۃ

(دوسرا ایڈیشن) ——— صفحات 480، قیمت 550 روپے

٭ عمدہ طباعت ٭ دیدہ زیب ٹائٹل اور مضبوط جلد ٭ امپورٹڈ آفسٹ پیپر

ملنے کے پتے

انجمن خُدّام القرآن خیبر پختونخوا' پشاور

18-A ناصر مینشن، ریلوے روڈ نمبر 2، شعبہ بازار پشاور، فون: 2584824,2214495(091)

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

36-K، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

جلد : 63

شمارہ : 1

ربیع الاوّل 1435ھ

جنوری 2014ء

فی شمارہ 25/-

مُدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِتعاون

اندرون ملک	250 روپے
بھارت وبنگلہ دیش	900 روپے
ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ	1200 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ	1500 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700 ' فون: 3-35869501

فیکس: 35834000، ای میل: maktaba@tanzeem.org

ای میل برائے ادارتی امور: publications@tanzeem.org

ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور

فون: 36366638 - 36316638 فیکس: 36313131

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال 5

دہشت گردی اور اس کا سدّباب — ایوب بیگ مرزا

بیانُ القُرآن 7

سورۃ النحل (آیات ۱ تا ۴۰) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

مطالعۂ حدیث 32

تقویٰ اور اس کی عملی شکلیں — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تعمیرِ سیرت 50

ذکرِ الٰہی: اطمینانِ قلب کا ذریعہ — عتیق الرحمٰن صدیقی

سیرت خیرالانامؐ 61

حیاتِ طیّبہ کا سخت ترین دن: یومِ طائف — حافظ محمد زاہد

تذکیر و موعظت 73

اُسوۂ حسنہ اور اسلامی اخلاق — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

فکر و نظر 79

نظامِ ربوبیت اور اقسامِ ہدایت — پروفیسر عبدالعظیم جانباز

کاروانِ حدیث 85

امام مسلمؒ اور ان کی ''صحیح'' — عبدالرشید عراقی

❁ ❁ ❁

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

دہشت گردی کے اسباب اور اس کا سدِّباب

پاکستان میں دہشت گردی نائن الیون کے بعد شروع ہوئی اور اس وقت یہ صورتِ حال ہے کہ پاکستان کے تمام بڑے بڑے شہر اس کی لپیٹ میں ہیں۔ ہمارے دانشور اس دہشت گردی کے خلاف چیخ و پکار تو کر رہے ہیں لیکن وہ یہ سوچنے اور سمجھنے کے لیے تیار نہیں کہ اس دہشت گردی کے اسباب کیا ہیں' کیا اس نے بلاوجہ جنم لے لیا ہے؟ قبائلی علاقوں کے وہ لوگ جو خوشدلی سے پاکستان کا حصہ بنے' جب پاکستانی فوج کے کمانڈر انچیف ڈگلس گریسی نے قائداعظم کی حکم عدولی کرتے ہوئے کشمیر پر حملہ کرنے سے انکار کر دیا تو یہی قبائلی آگے بڑھے اور آج جتنا کشمیر ہمارے پاس ہے وہ ان ہی قبائلیوں کے جہاد کی وجہ سے حاصل ہوا۔ پھر یہ کہ اگرچہ پاک افغان تعلقات طالبان کے دور کے علاوہ کبھی خوشگوار نہ رہے' لیکن پاکستان کو کبھی شمال مغربی سرحد پر فوج تعینات کرنے کی ضرورت نہ پڑی' اس سرحد کی حفاظت قبائلی خود کر لیتے تھے۔ لیکن نائن الیون کے بعد ہماری سیاسی اور فوجی قیادت نے امریکی احکامات کی تکمیل میں قبائلیوں کے خون سے جس طرح ہولی کھیلی ہے وہ ہماری تاریخ کا ایک بھیانک باب ہے۔ پاکستان نے ان علاقوں میں طیاروں سے بمباری کی اور بستیوں کی بستیوں کا صفایا کر دیا۔ امریکہ سے ڈرون حملے کروا کر انہیں چن چن کر مارا۔ قبائلیوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ بہادر بھی ہوتے ہیں اور منتقم مزاج بھی' لہٰذا وہ اس دلیل کی بنیاد پر پاکستان کی فوج کے خلاف میدان میں اتر آئے کہ اگر پاکستان امریکہ سے مدد لے کر ہمیں مرواتا ہے تو ہمیں بھی جہاں سے مدد ملے گی ہم پاکستان کے خلاف جنگ میں مدد حاصل کریں گے۔

فوجی طالع آزما پرویز مشرف نے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے امریکہ کا ساتھ دیا' اپنے اہم فوجی ہوائی اڈے امریکہ کے حوالے کر دیے اور ظلم عظیم یہ کیا کہ سی آئی اے کو ان علاقوں میں کام کرنے کی کھلی چھٹی دے دی۔ امریکی روایت یہ ہے کہ وہ دوست سے دشمنی کرنے میں کبھی جھجک محسوس نہیں کرتا۔ ان سی آئی اے کے ایجنٹوں نے بھی قبائلی علاقوں میں پاکستان دشمنی کے بیج

بوئے۔ لال مسجد کے سانحہ نے بھی جلتی پر تیل کا کام کیا اور بندوبستی علاقے کے بہت سے پختون بھی قبائلیوں سے مل کر پاکستانی فوج کے خلاف کارروائیاں کرنے لگے۔ ہم کسی صورت میں بھی کسی نوعیت کی دہشت گردی کے حق میں نہیں' لیکن سوال یہ ہے کہ جب کسی گھر پر ڈرون حملہ یا بمباری ہوگی اور سولہ میں سے چودہ افراد مارے جائیں گے تو پھر کوئی نصیحت' کوئی نکتہ دانی' کوئی فلسفۂ محبت ان بچ جانے والے دو افراد کی سمجھ میں کیسے آئے گا؟ یہ بات قابل فہم ہے کہ جو حملے پاکستان کے شہریوں پر ہوئے' جو مساجد' بارگاہوں اور بازاروں میں ہوئے ان میں وہ ''ریمنڈ ڈیوس'' ملوث تھے جنہیں امریکہ میں پاکستان کے سفیر راتوں رات ویزے جاری کرتے تھے اور وہ آج بھی پاکستان میں دہشت گردی کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ اچھے سے اچھے معاشرے میں بھی برے عناصر ہوتے ہیں جو پیسے کی لالچ میں سب کچھ حتیٰ کہ انسانی زندگیوں سے کھیلنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں' اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ امریکی ایجنٹوں کو قبائلی علاقوں سے ایسے کچھ نہ کچھ لوگ مل جاتے ہیں جو لالچ میں آ کر دہشت گردی کا ارتکاب کرتے ہوں گے۔ لیکن اگر ہم ان قبائلیوں سے اپنے معاملات کو درست کر لیں جو اس لیے لڑ رہے ہیں کہ ہم امریکہ کے اتحادی کیوں بنے' یا ہم ملک میں اسلامی شریعت نافذ کیوں نہیں کر رہے ہیں یا جو اپنے گھرانوں کے تباہ ہونے اور اپنے اہل خانہ کے مرنے سے انتقامی کارروائیوں پر اتر آئے ہیں ان سے مذاکرات کیے جائیں' ان سے معافی طلب کی جائے' ان کے نقصانات کی تلافی کرنے کی کوشش کی جائے تو بدکردار عناصر خود بخود الگ تھلگ ہو جائیں گے اور پھر انہیں زیر کرنا مشکل نہیں ہوگا۔ ہماری رائے میں دہشت گردی کے سدباب کے لیے مندرجہ ذیل اقدامات ناگزیر ہیں:

(۱) مرکز اور صوبہ کے زیر انتظام تمام آزاد علاقوں میں اسلام کو بحیثیت نظام نافذ کر دیا جائے۔ اسلامی نظام کو نافذ کرنے میں جو پیچیدگیاں پاکستان کے دوسرے علاقوں میں محسوس کی جاتی ہیں، آزاد علاقوں میں ایسی صورتِ حال نہیں ہے۔

(۲) حکومت کی جانب سے ایک معیّن عرصے کے لیے سیز فائر کا اعلان کیا جائے اور صرف جوابی کارروائی کی جائے۔

(۳) تمام گروپوں کو مذاکرات کی دعوت دی جائے۔ مذاکرات سے انکار کرنے والے گروپس کے خلاف بھی فوری کارروائی نہ کی جائے بلکہ ایک معیّن عرصہ کے لیے انہیں موقع دیا جائے۔

(باقی صفحہ 97 پر)

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ النَّحل

تمہیدی کلمات

سورۂ یونس سے شروع ہونے والے مکی سورتوں کے طویل سلسلے کی اب تک ہم چھ سورتوں کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ ان چھ سورتوں کو بھی ہم نے تین تین سورتوں کے مزید دو ذیلی گروپس میں تقسیم کیا تھا۔ پہلے گروپ میں شامل تین سورتیں (یونس‘ ہود اور یوسف) نسبتاً طویل ہیں‘ جبکہ دوسرے گروپ کی سورتیں (الرعد‘ ابراہیمؑ اور الحجر) نسبتاً چھوٹی ہیں۔ دوسرے گروپ کی اِن سورتوں میں پہلی دو یعنی سورۃ الرعد اور سورۂ ابراہیم میں نسبت زوجیت ہے جبکہ سورۃ الحجر بالکل منفرد نوعیت کی سورۃ ہے۔ اب سورۃ النحل سے مکی سورتوں کے اس طویل سلسلے کے تیسرے ذیلی گروپ کا آغاز ہو رہا ہے۔ اس گروپ میں سورۃ النحل‘ سورۂ بنی اسرائیل اور سورۃ الکہف شامل ہیں۔ یہ تینوں سورتیں بھی نسبتاً طویل ہیں۔ ان میں سورۃ النحل منفرد ہے جبکہ سورۂ بنی اسرائیل اور سورۃ الکہف میں جوڑے کا تعلق ہے۔

سورۃ النحل کا زمانۂ نزول مکہ کا آخری دور معلوم ہوتا ہے۔ اس سورۃ کی خاص اہمیت یہ ہے کہ اس میں اللہ کی نعمتوں کا ذکر بہت جامعیت کے ساتھ ہوا ہے اور اس کے مضامین کی سورۃ الانعام اور سورۃ الروم کے مضامین کے ساتھ گہری مشابہت پائی جاتی ہے۔

آیات ۱ تا ۹

اَتٰۤی اَمۡرُ اللّٰہِ فَلَا تَسۡتَعۡجِلُوۡہُ ؕ سُبۡحٰنَہٗ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ﴿۱﴾ یُنَزِّلُ الۡمَلٰٓئِکَۃَ
بِالرُّوۡحِ مِنۡ اَمۡرِہٖ عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖۤ اَنۡ اَنۡذِرُوۡۤا اَنَّہٗ

لَاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنَا فَاتَّقُوۡنِ ﴿۲﴾ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ ؕ تَعٰلٰی عَمَّا
یُشۡرِکُوۡنَ ﴿۳﴾ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ نُّطۡفَۃٍ فَاِذَا ہُوَ خَصِیۡمٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۴﴾ وَ الۡاَنۡعَامَ
خَلَقَہَا ۚ لَکُمۡ فِیۡہَا دِفۡءٌ وَّ مَنَافِعُ وَ مِنۡہَا تَاۡکُلُوۡنَ ﴿۵﴾ وَ لَکُمۡ فِیۡہَا جَمَالٌ
حِیۡنَ تُرِیۡحُوۡنَ وَ حِیۡنَ تَسۡرَحُوۡنَ ﴿۶﴾ وَ تَحۡمِلُ اَثۡقَالَکُمۡ اِلٰی بَلَدٍ لَّمۡ تَکُوۡنُوۡا
بٰلِغِیۡہِ اِلَّا بِشِقِّ الۡاَنۡفُسِ ؕ اِنَّ رَبَّکُمۡ لَرَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۷﴾ وَّ الۡخَیۡلَ وَ الۡبِغَالَ
وَ الۡحَمِیۡرَ لِتَرۡکَبُوۡہَا وَ زِیۡنَۃً ؕ وَ یَخۡلُقُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸﴾ وَ عَلَی اللّٰہِ قَصۡدُ
السَّبِیۡلِ وَ مِنۡہَا جَآئِرٌ ؕ وَ لَوۡ شَآءَ لَہَدٰىکُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿۹﴾

آیت ۱ ﴿اَتٰۤی اَمۡرُ اللّٰہِ فَلَا تَسۡتَعۡجِلُوۡہُ ؕ﴾ ’’اللہ کا حکم آن پہنچا ہے‘ پس تم جلدی مت مچاؤ۔‘‘

جب ہم نے اپنا رسولؐ بھیج دیا اور اس پر اپنا کلام بھی نازل کرنا شروع کر دیا ہے تو گویا فیصلہ کن وقت آن پہنچا ہے۔ اب معاملہ صرف مہلت کے دورانیے کا ہے کہ ہمارے رسول اور ہمارے پیغام کا انکار کرنے والوں کو مشیت الٰہی کے مطابق کس قدر مہلت ملتی ہے۔ بہرحال اب جلدی مچانے کی ضرورت نہیں۔ اللہ کا عذاب بس اب آیا ہی چاہتا ہے‘ اس کے لیے اب بہت زیادہ وقت نہیں رہ گیا۔

﴿سُبۡحٰنَہٗ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ﴿۱﴾﴾ ’’وہ پاک اور بلند و بالا ہے اُس شرک سے جو وہ کرتے ہیں۔‘‘

آیت ۲ ﴿یُنَزِّلُ الۡمَلٰٓئِکَۃَ بِالرُّوۡحِ مِنۡ اَمۡرِہٖ عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖۤ اَنۡ اَنۡذِرُوۡۤا اَنَّہٗ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنَا فَاتَّقُوۡنِ ﴿۲﴾﴾ ’’وہ اُتارتا ہے فرشتوں کو اپنے امر کی روح کے ساتھ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے‘ کہ خبردار کر دو (میرے بندوں کو) کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے پس تم میرا ہی تقویٰ اختیار کرو۔‘‘

بِالرُّوۡحِ مِنۡ اَمۡرِہٖ سے مراد اللہ کی وحی ہے۔ یعنی حضرت محمد ﷺ کو اللہ نے اپنی وحی کے لیے چُن لیا اور آپ ﷺ کی طرف حضرت جبرائیلؑ وحی لے کر آئے۔ یہاں پر لفظ ’’امر‘‘ کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ سورۃ الاعراف کی آیت ۵۴ میں فرمایا گیا: ﴿اَلَا لَہُ الۡخَلۡقُ

وَالۡاَمۡرُ ؕ﴾ ''آگاہ ہو جاؤ' اُسی کے لیے خلق ہے اور اُسی کے لیے امر''۔ یعنی عالمِ خلق اور عالمِ امر دو الگ الگ عالم ہیں۔ عالم امر کا معاملہ یہ ہے کہ اُس میں وقت کا عامل بالکل کارفرما نہیں۔ اس عالم میں کسی کام کے کرنے یا کوئی واقعہ وقوع پذیر ہونے میں وقت درکار نہیں ہوتا۔ بس اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہوتا ہے اور اس کے ''کُنۡ'' فرمانے سے وہ کام ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ سورۂ یٰسٓ میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّمَاۤ اَمۡرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیۡـًٔا اَنۡ یَّقُوۡلَ لَهٗ كُنۡ فَیَكُوۡنُ﴾ ''اُس کا امر تو یہی ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو بس یہی ہوتا کہ وہ اسے کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔''

اس کے برعکس عالم خلق میں کسی کام کے پایہ تکمیل تک پہنچنے میں وقت درکار ہوتا ہے۔ جیسے قرآن میں متعدد بار فرمایا گیا کہ اللہ نے زمین و آسمان چھ دنوں میں تخلیق کیے۔ اسی طرح دنیا کا سارا نظام عالم خلق کے اصولوں پر چل رہا ہے۔ مثلاً آم کی گٹھلی سے کونپلیں پھوٹتی ہیں' پھر بڑھتی ہیں اور پھر آہستہ آہستہ ایک تناور درخت بن جاتا ہے۔ اس سارے عمل میں وقت درکار ہوتا ہے۔

یہاں پر روح کے ذکر کے حوالے سے یہ بات اہم ہے کہ روح کا تعلق عالمِ امر سے ہے۔ عالم امر کی صرف تین چیزیں ہی ہمارے علم میں ہیں۔ ملائکہ' روح اور وحی۔ قرآن میں ملائکہ کو بھی روح کہا گیا ہے۔ جیسے حضرت جبرائیل علیہ السلام کے لیے روح القدس اور روح الامین کے الفاظ آئے ہیں۔ سورۃ الشعراء میں فرمایا گیا: ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوۡحُ الۡاَمِیۡنُ﴾ جبکہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۸۷ میں ارشاد ہوا: ﴿وَاَیَّدۡنٰهُ بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ ؕ﴾۔ اسی طرح قرآن میں وحی کو بھی روح کہا گیا ہے' اور یہ وحی نازل بھی روح پر ہوتی ہے۔ جب محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر وحی نازل ہوتی تو آپ ﷺ اس کا ادراک طبعی حواسِ خمسہ سے نہیں کرتے تھے' بلکہ وحی براہِ راست آپ ﷺ کے قلبِ مبارک پر نازل ہوتی تھی۔ اس لیے کہ قلبِ محمدیؐ روحِ محمدی ﷺ کا مسکن تھا: ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوۡحُ الۡاَمِیۡنُ عَلٰی قَلۡبِكَ لِتَكُوۡنَ مِنَ الۡمُنۡذِرِیۡنَ﴾ (الشعراء)۔ چنانچہ وحی بھی روح ہے' اس کو لانے والے جبرائیلؑ امین بھی روح ہیں اور اس کا نزول بھی روحِ محمدی ﷺ پر ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں جگر مرادآبادی کا یہ شعر ان کی کسی خاص کیفیت کا مظہر معلوم ہوتا ہے ؎

نغمہ وہی ہے نغمہ کہ جس کو روح سنے اور روح سنائے!

آیت ۳ ﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ ؕ تَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِكُوۡنَ﴾ ''اُس نے

پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ۔ وہ بہت بلند ہے اس شرک سے جو وہ کرتے ہیں۔''

آیت ۴ ﴿خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ نُّطۡفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِیۡمٌ مُّبِیۡنٌ﴾ ''اُس نے پیدا کیا انسان کو گندے پانی کی بوند سے' پھر یکایک وہ بن گیا کھلا جھگڑالو۔''

انسان اپنے خودساختہ نظریات کے حق میں خوب بحثیں کرتا ہے' عقلی و نقلی دلیلیں دیتا ہے اور زورِ خطابت سے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتا ہے۔

آیت ۵ ﴿وَالۡاَنۡعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمۡ فِیۡهَا دِفۡءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنۡهَا تَاۡكُلُوۡنَ﴾ ''اور چوپایوں کو بھی اُس نے پیدا کیا' ان میں تمہارے لیے گرمی کا سامان اور کئی دوسرے فائدے بھی ہیں' اور ان میں سے تم کھاتے بھی ہو۔''

بعض جانوروں کی اون سے تم لوگ لباس بنتے ہو' جو سردی کے موسم میں تمہیں گرمی پہنچاتا ہے' بعض جانوروں کے بالوں سے بہت سی دوسری چیزیں بناتے ہو۔ اسی طرح یہ جانور اور بھی بہت سی صورتوں میں تمہارے لیے مفید اور مددگار ہوتے ہیں' حتیٰ کہ تمہاری خوراک کی بیشتر ضروریات بھی انہی سے پوری ہوتی ہیں۔

آیت ۶ ﴿وَلَكُمۡ فِیۡهَا جَمَالٌ حِیۡنَ تُرِیۡحُوۡنَ وَحِیۡنَ تَسۡرَحُوۡنَ﴾ ''اور تمہارے لیے ان میں بڑی شان و شوکت ہے جب تم شام کو انہیں چرا کر لاتے ہو اور جب (صبح کے وقت) چرانے کے لیے لے جاتے ہو۔''

دیہاتی ماحول میں مویشیوں کی حیثیت بہت قیمتی سرمائے کی سی ہوتی ہے' اسی لیے انہیں مال مویشی کہا جاتا ہے۔ یہ جانور جب صبح چرنے کے لیے جاتے ہیں یا شام کے وقت جنگل سے چر کر واپس آ رہے ہوتے ہیں تو اُن کے مالکوں کے لیے یہ بڑا خوش کن منظر ہوتا ہے۔ جانوروں کا غلہ یا ریوڑ جتنا بڑا ہوگا' اس کے مالک کی حیثیت اور شان و شوکت اسی قدر زیادہ سمجھی جائے گی۔

آیت ۷ ﴿وَتَحۡمِلُ اَثۡقَالَكُمۡ اِلٰی بَلَدٍ لَّمۡ تَكُوۡنُوۡا بٰلِغِیۡهِ اِلَّا بِشِقِّ الۡاَنۡفُسِ ؕ﴾ ''اور وہ تمہارے بوجھ اٹھا کر لے جاتے ہیں ایسی بستیوں کی طرف جن تک تم نہیں پہنچنے والے ہوتے مگر جان توڑ کر۔''

ان میں ایسے جانور بھی ہیں جو ساز و سامان کے نقل و حمل میں تمہارے کام آتے ہیں اور

اُن کے بغیر تم یہ بھاری چیزیں اٹھا کر دور دراز علاقوں تک نہیں پہنچا سکتے۔

﴿اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝۷﴾ ''یقیناً تمہارا رب شفقت فرمانے والا' مہربان ہے۔''

آیت ۸ ﴿وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً ۭ﴾ ''اور (اسی نے پیدا کیے) گھوڑے اور خچر اور گدھے' کہ تم ان پر سواری کرو اور (تمہارے لیے ہے اُن میں) زینت بھی۔''

ان مویشیوں سے انسان کو بہت سے فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں اور یہ اس کے لیے باعثِ زیب وزینت بھی ہیں۔ خصوصی طور پر گھوڑا بہت حسین اور قیمتی جانور ہے اور اس کا مالک اسے اپنے لیے باعثِ فخر وتمکنت سمجھتا ہے۔

﴿وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۸﴾ ''اور (ایسی چیزیں بھی) وہ پیدا کرتا ہے جن کا تمہیں علم ہی نہیں۔''

یعنی یہ تو چند وہ چیزیں ہیں جن کے بارے میں تم لوگ جانتے ہو' مگر اللہ تعالیٰ تو بے شمار ایسی چیزیں بھی تخلیق فرماتا ہے جن کے بارے میں تمہیں کچھ بھی علم نہیں۔

آیت ۹ ﴿وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَاۗىِٕرٌ ۭ﴾ ''اور اللہ تک پہنچانے والا سیدھا راستہ ہے اور ان میں کچھ ٹیڑھے بھی ہیں۔''

یہ سیدھا راستہ توحید کا راستہ ہے۔ یہاں اس راستے کو ''قصد السبیل'' کا نام دیا گیا ہے۔ قرآن میں اسے صراطِ مستقیم بھی کہا گیا ہے اور سوآء السبیل بھی۔ یہی ایک راستہ ہے جو انسان کو اللہ تک پہنچاتا ہے' مگر بہت سے لوگ اس راستے سے بھٹک کر ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں پر مڑ جاتے ہیں جو انہیں گمراہی کے گڑھوں میں گرا دیتی ہیں۔

﴿وَلَوْ شَاۗءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝۹﴾ ''اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔''

اللہ اگر چاہتا تو سب انسانوں کو اسی ایک سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق اور سمجھ بوجھ دے دیتا۔

آیات ۱۰ تا ۲۳

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ ۝۱۰ يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۱۱ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝۱۲ۙ وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ۝۱۳ وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۱۴ وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَاَنْهٰرًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝۱۵ۙ وَعَلٰمٰتٍ ۭ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝۱۶ اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۱۷ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۸ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ۝۱۹ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْـــًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ۝۲۰ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَاۗءٍ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ۝۲۱ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ۝۲۲ لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ۝۲۳

آیت ۱۰ ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ ۝۱۰﴾ ''وہی ہے جس نے اتارا ہے آسمان سے تمہارے لیے پانی' اسی سے ہے (تمہارا) پینا اور اسی سے ہیں درخت (نباتات وغیرہ)' جن میں تم (اپنے جانوروں کو) چراتے ہو۔''

اللہ تعالیٰ ہی بارش اور برف کی صورت میں بادلوں سے پانی برساتا ہے جس پر انسانی

زندگی کا براہِ راست انحصار ہے اور پھر یہی پانی بے شمار نباتاتی اور حیوانی مخلوقات کو زندگی بخشتا ہے جو انسان ہی کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔

آیت ۱۱ ﴿يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ﴾ ''وہ اُگاتا ہے تمہارے لیے اس (پانی) سے کھیتی اور زیتون اور کھجوریں اور انگور اور ہر قسم کے پھل۔''

﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۱۱﴾ ''یقیناً اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ کی شانِ خلّاقی کے بے شمار انداز ہیں' اس کی تخلیق میں لامحدود تنوع' بوقلمونی اور رنگارنگی ہے۔ چنانچہ اب ایک دوسرے پہلو سے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ذکر ہونے جا رہا ہے:

آیت ۱۲ ﴿وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۙ﴾ ''اور اُس نے مسخر کر دیا تمہارے لیے رات اور دن کو''

انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں رات اپنی جگہ اہم ہے اور دن کی اپنی اہمیت ہے۔ رات میں مجموعی طور پر ایک سکون ہے۔ یہ انسانوں اور دوسرے جانداروں کے لیے باعثِ راحت ہے' اس میں وہ آرام کرتے ہیں' سوتے ہیں اور صبح تازہ دم ہو کر اٹھتے ہیں۔ دوسری طرف دن میں بھاگ دوڑ' محنت' جدوجہد اور مختلف النوع انسانی سرگرمیاں ممکن ہوتی ہیں۔ اگر اس پہلو سے دنیا کے اجتماعی نظام کو دیکھا جائے تو یہ پورا نظام رات اور دن کے وجود کا مرہونِ منت نظر آتا ہے۔ نباتاتی نظام کو ہی لے لیجیے۔ اس کے لیے رات اور دن دونوں ہی ناگزیر ہیں۔ دن کو سورج کی روشنی اور تمازت سے نباتات کے لیے Photosynthesis کا عمل ممکن ہوتا ہے جو ان کی نشوونما کے لیے ناگزیر ہے۔ فصلوں اور پھلوں کو بھی پکنے کے لیے سورج کی روشنی اور حرارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوسری طرف رات کو نباتات respiration کے عمل کے ذریعے سے آکسیجن حاصل کرتے ہیں۔ گویا رات اور دن کے بغیر نباتات کا وجود ممکن ہی نہیں ہے اور انسانی زندگی میں نباتات کے عمل دخل کا تصور کریں تو اس ایک مثال سے ہی یہ حقیقت سمجھ میں آ جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دن اور رات کو انسان کے لیے مسخر کر دینا کتنی بڑی نعمت ہے۔

﴿وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ؕ﴾ ''اور سورج اور چاند کو'

اور ستارے بھی مسخر ہیں اُسی کے حکم سے۔''

پورا نظامِ شمسی اور تمام اجرامِ فلکی اللہ تعالیٰ کے حکم سے انسان کی نفع رسانی میں مصروف ہیں۔

﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝۱۲﴾ ''یقیناً اس میں نشانیاں ہیں عقل والوں کے لیے۔''

آیت ۱۳ ﴿وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ؕ﴾ ''اور جو چیزیں اُس نے پھیلا دی ہیں تمہارے لیے زمین میں اُن کے مختلف رنگ ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے زمین میں رنگارنگ قسم کے حیوانات' نباتات اور جمادات پیدا کیے ہیں۔

﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ۝۱۳﴾ ''یقیناً اس میں بھی نشانی ہے اُن لوگوں کے لیے جو نصیحت اخذ کریں۔''

آیت ۱۴ ﴿وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا﴾ ''اور وہی ہے جس نے سمندر کو تمہاری ضروریات پوری کرنے میں لگا دیا ہے تاکہ تم کھاؤ اس سے تازہ گوشت''

سمندری خوراک ہمیشہ سے انسانی زندگی میں بہت اہم رہی ہے۔ دورِ جدید میں اس کی افادیت مزید نمایاں ہو کر سامنے آئی ہے جس کی وجہ سے اس کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔

﴿وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ﴾ ''اور تاکہ تم نکالو اس میں سے بناؤ سنگھار کا سامان جو تم پہنتے ہو۔''

سمندر سے موتی اور بہت سی دوسری ایسی اشیاء نکالی جاتی ہیں جن سے زیورات اور آرائش و زیبائش کا سامان تیار ہوتا ہے۔

﴿وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ﴾ ''اور تم دیکھتے ہو کشتیوں کو کہ پانی کو چیرتی ہوئی چلتی ہیں اس (سمندر) میں''

﴿وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۱۴﴾ ''اور تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو اور تاکہ تم شکر کرو۔''

آیت ۱۵ ﴿وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَاَنْهٰرًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝۱۵﴾ ''اور اُس نے زمین میں لنگر ڈال دیے ہیں کہ تمہیں لے کر لڑھک نہ

جائے اور اس میں ندیاں (بہادی ہیں) اور راستے (بنا دیے ہیں) تا کہ تم اپنی منزلوں تک پہنچا کرو۔''

یہاں اَنْھٰرًا وَّسُبُلًا کے اکٹھے ذکر کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو عملی طور پر بھی ان کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ پہاڑی سلسلوں میں عام طور پر ندیوں کی گزرگاہوں کے ساتھ ساتھ ہی راستے بنتے ہیں۔ اسی طرح پہاڑوں کے درمیان قدرتی وادیاں انسانوں کی گزرگاہیں بھی بنتی ہیں اور پانی کے ریلوں کو راستے بھی فراہم کرتی ہیں۔

آیت ۱۶ ﴿وَعَلٰمٰتٍ ؕ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۶﴾﴾ ''اور دوسری علامتیں بھی ہیں۔ اور وہ ستاروں سے بھی رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی مدد کے لیے زمین میں طرح طرح کی علامتیں بنائیں تا کہ مختلف علاقوں اور راستوں کی پہچان ہو سکے۔ اسی طرح آسمان کے ستاروں کو بھی سمتوں اور راستوں کے تعین کا ایک ذریعہ بنا دیا۔ پرانے زمانے میں سمندری اور صحرائی سفررات کے وقت ستاروں کی مدد سے ہی ممکن ہوتے تھے۔

آیت ۱۷ ﴿اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۷﴾﴾ ''تو کیا جو (یہ سب کچھ) پیدا کرتا ہے اُن کی طرح ہے جو (کچھ بھی) پیدا نہیں کرتے؟ تو کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے؟''

مشرکینِ عرب نے مختلف ناموں سے جو بت بنا رکھے تھے اُن کے بارے میں اُن کا عقیدہ تھا کہ وہ اللہ کے ہاں ان کی سفارش کریں گے۔ سورۂ یونس کی آیت ۱۸ میں ان کے اس عقیدے کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے: ﴿وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ﴾ ''اور وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں''۔ اللہ کے بارے میں ان کا ماننا تھا کہ وہ کائنات اور اس میں موجود ہر چیز کا خالق ہے اور وہ یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ ان کے معبودوں کا اس تخلیق میں کوئی حصہ نہیں اور نہ ہی وہ کوئی چیز تخلیق کر سکتے ہیں۔ قرآن میں ان کے اس عقیدے کا بھی بار بار ذکر آیا ہے: ﴿وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ﴾ (لقمان: ۲۵) ''اگر آپؐ ان سے پوچھیں گے کہ کس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو تو لازماً یہی کہیں گے کہ اللہ نے!'' ان لوگوں کے اسی عقیدے کی بنیاد پر یہاں یہ سوال پوچھا گیا ہے کہ تمہارے یہ خود ساختہ معبود، جو کچھ بھی تخلیق کرنے کی قدرت نہیں رکھتے، کیا اُس اللہ کی

مانند ہو سکتے ہیں جو اس کائنات اور اس میں موجود ہر چیز کا خالق ہے؟ اور اگر تم تسلیم کرتے ہو کہ اس سوال کا جواب نفی میں ہے تو کیا پھر بھی تم لوگ نصیحت نہیں پکڑتے ہو؟

آیت ۱۸ ﴿وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ﴾ ''اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گنو تو اُن کا احاطہ نہیں کر سکو گے۔''

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی گنتی تو کجا اس کی بے شمار نعمتیں ایسی ہیں جن سے انسان فیض یاب تو ہو رہا ہے لیکن ان تک انسان کے علم اور شعور کی ابھی پہنچ ہی نہیں۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸﴾﴾ ''یقیناً اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔''

آیت ۱۹ ﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴿۱۹﴾﴾ ''اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو۔''

آیت ۲۰ ﴿وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿۲۰﴾﴾ ''اور جن کو یہ پکارتے ہیں اللہ کے سوا وہ کچھ پیدا نہیں کرتے، بلکہ وہ تو خود پیدا کیے گئے ہیں۔''

انبیاء و رسلؑ ہوں، ملائکہ ہوں یا اولیاء اللہ، سب مخلوق ہیں، خالق صرف اللہ کی ذات ہے۔

آیت ۲۱ ﴿اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۲۱﴾﴾ ''مُردہ ہیں، زندہ نہیں ہیں۔ اور وہ نہیں جانتے کہ کب اٹھائے جائیں گے۔''

جن اولیاء اللہ کے ناموں پر انہوں نے بت بنا رکھے ہیں وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں، وہ فوت ہو چکے ہیں اور انہیں کچھ معلوم نہیں کہ قیامت کب برپا ہو گی اور کب انہیں دوبارہ اٹھایا جائے گا۔

آیت ۲۲ ﴿اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ﴾ ''تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔''

﴿فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۲۲﴾﴾ ''تو وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اُن کے دل منکر ہیں اور وہ تکبر کرتے ہیں۔''

اس نکتے کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں آخرت کا یقین نہیں ہے وہ حق بات کو قبول کرنے سے کیوں جھجکتے ہیں اور ان کے اندر استکبار کیوں پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں قرآن کا فلسفہ یہ ہے کہ جو شخص فطرتِ سلیمہ کا مالک ہے اس کے اندر اچھائی اور برائی کی تمیز موجود ہوتی ہے۔ اس کا دل اس حقیقت کا قائل ہوتا ہے کہ اچھائی کا اچھا بدلہ ملنا

چاہیے اور برائی کا برا ع ''گندم از گندم بروید' جوز جو!''

یہی فلسفہ یا تصور منطقی طور پر ایمان بالآخرت کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ مگر دنیا میں جب پوری طرح نیکی کی جزا اور برائی کی سزا ملتی ہوئی نظر نہیں آتی تو ایک صاحبِ شعور انسان لازماً سوچتا ہے کہ اعمال اور اس کے نتائج کے اعتبار سے دنیوی زندگی ادھوری ہے اور اس دنیا میں انصاف کی فراہمی کماحقہ ممکن ہی نہیں۔ مثلاً اگر ایک سترّ سالہ بوڑھا ایک نوجوان کو قتل کر دے تو اس دنیا کا قانون اسے کیا سزا دے گا؟ ویسے تو یہاں انصاف تک پہنچنے کے لیے بہت سے کٹھن مراحل طے کرنے پڑتے ہیں' لیکن اگر یہ تمام مراحل طے کر کے انصاف مل بھی جائے تو قانون زیادہ سے زیادہ اس بوڑھے کو پھانسی پر لٹکا دے گا۔ لیکن کیا اس بوڑھے کی جان واقعی اس نوجوان مقتول کی جان کے برابر ہے؟ نہیں' ایسا ہرگز نہیں ہے۔ وہ نوجوان تو اپنے خاندان کا واحد سہارا تھا' اس کے چھوٹے چھوٹے بچے یتیم ہوئے' ایک نوجوان عورت بیوہ ہوئی' خاندان کا معاشی سہارا چھن گیا۔ اس طرح اس کے لواحقین اور خاندان کے لیے اس قتل کے اثرات کتنے گھمبیر ہوں گے اور کہاں کہاں تک پہنچیں گے' اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ دوسری طرف وہ بوڑھا شخص جو اپنی طبعی عمر گزار چکا تھا' جس کے بچے خود مختار زندگیاں گزار رہے ہیں' جس کی کوئی معاشی ذمہ داری بھی نہیں ہے' اس کے پھانسی پر چڑھ جانے سے اس کے پس ماندگان پر ویسے اثرات مرتب نہیں ہوں گے جیسے اس نوجوان کی جان جانے سے اس کے پس ماندگان پر ہوئے تھے۔ ایسی صورت میں دنیا کا کوئی قانون مظلوم کو پورا پورا بدلہ دے ہی نہیں سکتا۔ ایسی مثالیں عقلی اور منطقی طور پر ثابت کرتی ہیں کہ یہ دُنیا نامکمل ہے۔ اس دنیا کے معاملات اور افعال کا ادھورا پن ایک دوسری دنیا کا تقاضا کرتا ہے جس میں اس دنیا کے تشنہ تکمیل رہ جانے والے معاملات پورے انصاف کے ساتھ اپنے اپنے منطقی انجام کو پہنچیں۔ اب ایک ایسا شخص جو فطرتِ سلیمہ کا مالک ہے' اس کے شعور میں نیکی اور بدی کا ایک واضح اور غیر مبہم تصور موجود ہے' وہ لازمی طور پر آخرت کے بارے میں مذکورہ منطقی نتیجے پر پہنچے گا اور پھر وہ قرآن کے تصورِ آخرت کو قبول کرنے میں بھی پس و پیش نہیں کرے گا' مگر اس کے مقابلے میں ایک ایسا شخص جس کے شعور میں نیکی اور بدی کا واضح تصور موجود نہیں' وہ قرآن کے تصورِ آخرت پر بھی دل سے یقین نہیں رکھتا اور فکرِ آخرت سے بے نیاز ہو کر غرور اور تکبر میں بھی مبتلا ہو چکا ہے' اُس کا دل پیغامِ حق کو قبول کرنے سے بھی منکر ہوگا۔ ایسے شخص کے سامنے حکیمانہ درس اور عالمانہ وعظ سب بے اثر ثابت ہوں گے۔

آیت ٢٣ ﴿لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ؕ﴾ ''کوئی شک نہیں کہ اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں اور جو کچھ وہ چھپاتے ہیں۔''

﴿اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ۝٢٣﴾ ''یقیناً وہ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

آیات ٢٤ تا ٣٢

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَاۤ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۙ قَالُوْۤا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝٢٤ۙ لِيَحْمِلُوْۤا
اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۙ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ
اَلَا سَاۤءَ مَا يَزِرُوْنَ ۝٢٥ۧ قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ
الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا
يَشْعُرُوْنَ ۝٢٦ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ وَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَاۤءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ
تُشَاۤقُّوْنَ فِيْهِمْ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوْۤءَ عَلَى
الْكٰفِرِيْنَ ۝٢٧ۙ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰۤىِٕكَةُ ظَالِمِيْۤ اَنْفُسِهِمْ ۠ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ
مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْۤءٍ ؕ بَلٰۤى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝٢٨ فَادْخُلُوْۤا
اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ۝٢٩ وَقِيْلَ
لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَاۤ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ؕ قَالُوْا خَيْرًا ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ
الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ؕ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ۝٣٠ۙ جَنّٰتُ عَدْنٍ
يَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَاۤءُوْنَ ؕ كَذٰلِكَ يَجْزِي
اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ ۝٣١ۙ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰۤىِٕكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ
ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝٣٢

آیت ٢٤ ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَاۤ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۙ﴾ ''اور جب اُن سے پوچھا جاتا ہے کہ تمہارے رب نے کیا نازل کیا ہے؟''

نبی اکرم ﷺ کی دعوت کا چرچا جب مکہ کے اطراف و اکناف میں ہونے لگا تو لوگ اہلِ

مکہ سے پوچھتے کہ محمد (ﷺ) جو کہہ رہے ہیں کہ مجھ پر اللہ کا کلام نازل ہوتا ہے' تم لوگوں نے تو یہ کلام سنا ہے' چنانچہ تمہاری اس کے بارے میں کیا رائے ہے؟ اس کے مضامین کیا ہیں؟

﴿قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٢٤﴾﴾ ''وہ کہتے ہیں کہ پہلے لوگوں کے قصے ہیں۔''

کہ یہ کلام تو بس پرانے قصے کہانیوں پر مشتمل ہے۔ یہ سب گزشتہ قوموں کے واقعات ہیں جو اِدھر اُدھر سے سن کر ہمیں سنا دیتے ہیں اور پھر ہم پر دھونس جماتے ہیں کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔

آیت ۲۵ ﴿لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۙ﴾ ''تا کہ یہ اٹھائیں اپنے (گناہوں کے) بوجھ پورے کے پورے قیامت کے دن''

یوں ان کے دل حق کی طرف مائل نہیں ہو رہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ روز قیامت وہ اپنی اس گمراہی اور سرکشی کے وبال میں گرفتار ہوں گے۔

﴿وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ﴾ ''اور کچھ اُن لوگوں کے بوجھ بھی جنہیں یہ گمراہ کر رہے ہیں لاعلمی میں۔''

یعنی قیامت کے دن وہ نہ صرف اپنی گمراہی کا خمیازہ بھگتیں گے' بلکہ بہت سے دوسرے لوگوں کی گمراہی کا وبال بھی ان پر ڈالا جائے گا جنہیں اپنے نام نہاد' دانشورانہ مشوروں سے انہوں نے گمراہ کیا ہوگا۔ جیسے قرب و جوار کے لوگ جب اہل مکہ سے اس کلام کے بارے میں پوچھتے تھے یا مکہ کے عام لوگ قرآن سے متاثر ہو کر اپنے سرداروں سے پوچھتے تھے کہ اُن کی اس کلام کے بارے میں کیا رائے ہے؟ ایسی صورت میں یہ لوگ اپنے عوام کو یہ کہہ کر گمراہ کرتے تھے کہ ہاں ہم نے بھی یہ کلام سنا ہے' اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے' بس سنی سنائی باتیں ہیں اور پرانے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔

﴿اَلَا سَاۗءَ مَا يَزِرُوْنَ ﴿٢٥﴾﴾ ''آگاہ رہو! بہت بُرا ہوگا جو بوجھ وہ اٹھائے ہوں گے۔''

آیت ۲۶ ﴿قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ ''(اسی طرح کی) چالیں چلی تھیں انہوں نے بھی جو ان سے پہلے تھے''

ان سے پہلے بھی مختلف اقوام کے لوگوں نے ہمارے انبیاء و رسل کی مخالفت کی تھی اور ان کی دعوت کو ناکام کرنے کے لیے طرح طرح کے حربے آزمائے تھے اور سازشیں کی تھیں۔

﴿فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ﴾ ''تو اللہ

حملہ آور ہوا ان کے قلعوں پر بنیادوں سے' پھر گر پڑیں ان پر چھتیں ان کے اوپر سے''

جب اللہ تعالیٰ کا فیصلہ آیا تو مخالفین کی تمام سازشوں کو جڑوں سے اُکھاڑ پھینکا گیا اور ان کی بستیوں کو تلپٹ کر دیا گیا۔ سدوم اور عامورہ کی بستیوں کے بارے میں ہم پڑھ آئے ہیں: ﴿فَلَمَّا جَاۗءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا﴾ (ہود:۸۲) ''پھر جب آ گیا ہمارا حکم تو ہم نے کر دیا اس کے اوپر والے حصے کو اس کا نیچے والا''۔ یعنی اس کو تہ و بالا کر دیا۔ اس سلسلے میں قرآن حکیم کے اندر تو صرف انہی چند اقوام کا ذکر آیا ہے جن سے اہلِ عرب واقف تھے' ورنہ رسول تو ہر علاقے اور ہر قوم میں آتے رہے ہیں' از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴿٧﴾﴾ (الرعد) ''اور ہر قوم کے لیے ایک راہنما ہے۔''

خود ہندوستان کے علاقے میں بھی بہت سے انبیاء و رسلؑ کے مبعوث ہونے کے آثار ملتے ہیں۔ ہریانہ' ضلع حصار' جس علاقے میں میرا بچپن گزرا' وہاں مختلف مقامات پر سیاہ رنگ کی راکھ کے بڑے بڑے ٹیلے موجود تھے' جن کی کھدائی کے دوران بستیوں کے آثار ملتے تھے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے یہ اپنے زمانے کی پُر رونق بستیاں تھیں' ان کے باشندوں نے اپنے رسولوںؑ کی نافرمانیاں کیں اور انہیں عذابِ خداوندی نے جلا کر بھسم کر ڈالا' جس طرح پومپیائی پر لاوے کی بارش ہوئی اور پوری بستی جلتے ہوئے لاوے کے اندر دب گئی۔ اس علاقے میں دریائے سرسوتی بہتا تھا جو ہندوستان کا ایک بہت بڑا دریا تھا اور اسے مقدس مانا جاتا تھا (دریائے گنگا بہت بعد کے زمانے میں وجود میں آیا۔) آج دریائے سرسوتی کا کچھ پتا نہیں چلتا کہ یہ کہاں کہاں سے گزرتا تھا اور ماہرین آثارِ قدیمہ اس کی گزرگاہ تلاش کر رہے ہیں۔ یہ سب آثار بتاتے ہیں کہ ہندوستان کے اندر مختلف زمانوں میں انبیاء و رسلؑ آئے اور ان کی نافرمانیوں کے سبب اُن کی قومیں اللہ کے عذاب کا شکار ہوئیں۔ ان آثار کی شہادتوں کے علاوہ کچھ ایسے مکاشفات بھی ہیں کہ مشرقی پنجاب کے جس علاقے میں شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کا مدفن ہے اس علاقے میں تیس انبیاء مدفون ہیں۔ واللہ اعلم!

﴿وَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٢٦﴾﴾ ''اور اُن پر عذاب وہاں سے آیا جہاں سے انہیں گمان تک نہ تھا۔''

آیت ۲۷ ﴿ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ وَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَاۗءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَاۗقُّوْنَ فِيْهِمْ ۭ﴾ ''پھر قیامت کے دن اللہ انہیں رسوا کرے گا اور کہے گا: کہاں ہیں میرے وہ

شریک جن کی حمیت میں تم جھگڑتے تھے؟‘‘

قیامت کے دن انہیں مزید رسوا کرنے کے لیے ان سے پوچھا جائے گا کہ آج تمہارے وہ من گھڑت معبود کہاں ہیں جن کی حمایت اور حمیت کی وجہ سے تم بڑی بڑی جنگیں لڑنے پر تیار ہو جاتے تھے؟

﴿قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوْٓءَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝۲۷﴾

’’کہیں گے وہ لوگ جن کو علم دیا گیا ہے کہ یقیناً آج کے دن رسوائی اور بدبختی کافروں ہی کے لیے ہے۔‘‘

آیت ۲۸ ﴿الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۠﴾ ’’جن (کی روحوں) کو قبض کرتے ہیں فرشتے اس حال میں کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے تھے‘‘

ایسے لوگ جنہیں اپنی زندگی میں اللہ یاد ہے نہ آخرت‘ نیکی کی رغبت ہے نہ برائی سے نفرت‘ بس اپنی عیش کوشی اور نفس پرستی میں مگن ہیں۔ اسی حالت میں جب فرشتے ان کے پاس پروانۂ موت لے کر آدھمکیں گے:

﴿فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ ۭ﴾ ’’تو (اُس وقت) وہ اطاعت پیش کریں گے کہ ہم تو کوئی بُرے کام نہیں کر رہے تھے۔‘‘

﴿بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۲۸﴾ ’’(تو فرشتے کہیں گے) کیوں نہیں‘ اللہ خوب جانتا ہے اسے جو کچھ تم کر رہے تھے۔‘‘

موت کے فرشتوں کے سامنے وہ سرِتسلیم خم کرتے ہوئے اپنے اسلام اور اطاعت کا اظہار کریں گے اور اس طرح ان کے سامنے بھی جھوٹ بولنے کی کوشش کریں گے۔

آیت ۲۹ ﴿فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ﴾ ’’اب تم داخل ہو جاؤ جہنم کے دروازوں میں‘ اسی میں ہمیشہ ہمیش رہنے کے لیے۔‘‘

﴿فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ۝۲۹﴾ ’’پس کیا ہی برا ٹھکانہ ہے متکبرین کا!‘‘

آیت ۳۰ ﴿وَقِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۭ﴾ ’’اور (جب) پوچھا جاتا ہے اہلِ تقویٰ سے کہ یہ کیا نازل کیا ہے تمہارے رب نے؟‘‘

دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں‘ جن کے دلوں میں اخلاقی حس بیدار اور جن کی روحیں زندہ ہیں‘ جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ جو کلام آپ لوگوں کو سناتے ہیں وہ کیا ہے؟

﴿قَالُوْا خَيْرًا ۭ﴾ ’’وہ کہتے ہیں بھلائی۔‘‘

یعنی یہ کلام خیر ہی خیر ہے اور ہماری ہی بھلائی کے لیے نازل ہوا ہے۔

﴿لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۭ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ۭ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ۝۳۰﴾ ’’جن لوگوں نے نیکی کی روش اختیار کی ان کے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے‘ اور آخرت کا گھر تو کہیں بہتر ہے۔ اور کیا ہی اچھا ہے وہ گھر متقیوں کا!‘‘

آیت ۳۱ ﴿جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَاۗءُوْنَ ۭ﴾ ’’باغات ہمیشہ رہنے والے جن میں وہ داخل ہوں گے‘ ان کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی‘ ان کے لیے وہاں ہر وہ شے ہوگی جو وہ چاہیں گے۔‘‘

﴿كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ ۝۳۱﴾ ’’اسی طرح اللہ بدلہ دے گا اپنے متقی بندوں کو۔‘‘

آیت ۳۲ ﴿الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ﴾ ’’ان (کی روحوں) کو فرشتے قبض کرتے ہیں درآنحالیکہ وہ پاک ہوتے ہیں‘‘

جن کی روحیں پاکیزہ اور جن کی زندگیاں تقویٰ کی آئینہ دار ہوتی ہیں‘ جب اُن کے پاس موت کے فرشتے آتے ہیں تو:

﴿يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۳۲﴾ ’’کہتے ہیں سلام ہو آپ پر‘ داخل ہو جایئے جنت میں اپنے اعمال کے بدلے میں۔‘‘

آیات ۳۳ تا ۴۰

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ ۭ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝

فَاَصَابَهُمۡ سَیِّاٰتُ مَا عَمِلُوۡا وَحَاقَ بِهِمۡ مَّا كَانُوۡا بِهٖ یَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ﴿۳۴﴾ وَقَالَ
الَّذِیۡنَ اَشۡرَكُوۡا لَوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدۡنَا مِنۡ دُوۡنِهٖ مِنۡ شَیۡءٍ نَّحۡنُ وَلَاۤ
اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمۡنَا مِنۡ دُوۡنِهٖ مِنۡ شَیۡءٍ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِیۡنَ مِنۡ
قَبۡلِهِمۡ ۚ فَهَلۡ عَلَی الرُّسُلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ ﴿۳۵﴾ وَلَقَدۡ بَعَثۡنَا فِیۡ كُلِّ اُمَّةٍ
رَّسُوۡلًا اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ وَاجۡتَنِبُوا الطَّاغُوۡتَ ۚ فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ هَدَی اللّٰهُ
وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ حَقَّتۡ عَلَیۡهِ الضَّلٰلَةُ ؕ فَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَانۡظُرُوۡا كَیۡفَ
كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُكَذِّبِیۡنَ ﴿۳۶﴾ اِنۡ تَحۡرِصۡ عَلٰی هُدٰىهُمۡ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یَهۡدِیۡ
مَنۡ یُّضِلُّ وَمَا لَهُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِیۡنَ ﴿۳۷﴾ وَاَقۡسَمُوۡا بِاللّٰهِ جَهۡدَ اَیۡمَانِهِمۡ ۙ لَا
یَبۡعَثُ اللّٰهُ مَنۡ یَّمُوۡتُ ؕ بَلٰی وَعۡدًا عَلَیۡهِ حَقًّا وَّلٰكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا
یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۸﴾ لِیُبَیِّنَ لَهُمُ الَّذِیۡ یَخۡتَلِفُوۡنَ فِیۡهِ وَلِیَعۡلَمَ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡۤا
اَنَّهُمۡ كَانُوۡا كٰذِبِیۡنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّمَا قَوۡلُنَا لِشَیۡءٍ اِذَاۤ اَرَدۡنٰهُ اَنۡ نَّقُوۡلَ لَهٗ كُنۡ
فَیَكُوۡنُ ﴿۴۰﴾

آیت ۳۳ ﴿هَلۡ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ تَاۡتِیَهُمُ الۡمَلٰٓئِكَةُ اَوۡ یَاۡتِیَ اَمۡرُ رَبِّكَ ؕ﴾ ’’اب یہ لوگ کس شے کے منتظر ہیں سوائے اس کے کہ آ دھمکیں ان پر فرشتے یا آ جائے فیصلہ آپؐ کے رب کا!‘‘

گزشتہ بارہ برس سے رسول اللہ ﷺ قریش مکہ کو دعوت دے رہے ہیں‘ دو تہائی کے قریب قرآن بھی اب تک نازل ہو چکا ہے۔ چنانچہ ان لوگوں کو اب مزید کس چیز کا انتظار ہے؟ اب تو بس یہی مرحلہ باقی رہ گیا ہے کہ فرشتے اللہ کا فیصلہ لے کر پہنچ جائیں اور وہ نقشہ سامنے آ جائے جس کی جھلک سورۃ الفجر میں اس طرح دکھائی گئی ہے: ﴿وَجَآءَ رَبُّكَ وَالۡمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴿۲۲﴾ وَجِایۡٓءَ یَوۡمَئِذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۙ یَوۡمَئِذٍ یَّتَذَكَّرُ الۡاِنۡسَانُ وَاَنّٰی لَهُ الذِّكۡرٰی ﴿۲۳﴾﴾ ’’اور آئے گا آپؐ کا رب اور فرشتے صف بہ صف۔ اور لائی جائے گی اُس دن جہنم‘ اُس دن ہوش آئے گا انسان کو‘ مگر کیا فائدہ ہو گا تب اسے اس ہوش کا!‘‘

﴿كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنۡ كَانُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ

یَظۡلِمُوۡنَ ﴿۳۳﴾﴾ ’’یہی روش اختیار کی تھی انہوں نے بھی جو ان سے پہلے تھے۔ اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا‘ بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے۔‘‘

جن گزشتہ اقوام کے عبرت ناک انجام کے بارے میں تفصیلات قرآن میں بتائی جا رہی ہیں انہیں ان کے اپنے کرتوتوں کی سزا ملی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر قطعاً ظلم نہیں ہوا تھا۔

آیت ۳۴ ﴿فَاَصَابَهُمۡ سَیِّاٰتُ مَا عَمِلُوۡا وَحَاقَ بِهِمۡ مَّا كَانُوۡا بِهٖ یَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ﴿۳۴﴾﴾ ’’پھر ان پر واقع ہو کر رہیں وہ برائیاں جو وہ کرتے تھے اور گھیر لیا ان کو اسی نے جس کا وہ استہزا کرتے تھے۔‘‘

آیت ۳۵ ﴿وَقَالَ الَّذِیۡنَ اَشۡرَكُوۡا لَوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدۡنَا مِنۡ دُوۡنِهٖ مِنۡ شَیۡءٍ نَّحۡنُ وَلَاۤ اٰبَآؤُنَا﴾ ’’اور کہتے ہیں یہ مشرک لوگ کہ اگر اللہ چاہتا تو اللہ کے سوا کسی کی پوجا نہ کرتے‘ نہ ہم اور نہ ہمارے آباء و اَجداد‘‘

ان کی دلیل یہ تھی کہ اس دنیا میں تو جو اللہ چاہتا ہے وہی کچھ ہوتا ہے‘ وہ عَلٰی كُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ہے۔ اگر وہ چاہتا کہ ہم کوئی دوسرے معبود نہ بنائیں اور ان کی پرستش نہ کریں‘ تو کیسے ممکن تھا کہ ہم ایسا کر پاتے؟ چنانچہ اگر اللہ نے ہمیں اس سے روکا نہیں ہے تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اس میں اس کی مرضی شامل ہے اور اس کی طرف سے ہمیں ایسا کرنے کی اجازت ہے۔

﴿وَلَا حَرَّمۡنَا مِنۡ دُوۡنِهٖ مِنۡ شَیۡءٍ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ۚ﴾ ’’اور نہ حرام قرار دیتے ہم اس کے (حکم کے) بغیر کسی بھی چیز کو۔ اسی طرح کیا تھا اُن لوگوں نے بھی جو ان سے پہلے تھے۔‘‘

﴿فَهَلۡ عَلَی الرُّسُلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ ﴿۳۵﴾﴾ ’’پس نہیں ہے رسولوں پر کچھ ذمہ داری سوائے واضح طور پر پہنچا دینے کے۔‘‘

ہمارے رسولؑ اس قسم کی کٹ حجتی اور کج بحثی میں نہیں الجھتے۔ ان کی ذمہ داری ہمارا پیغام واضح طور پر پہنچا دینے کی حد تک ہے اور یہ ذمہ داری ہمارے رسولؑ ہمیشہ سے پوری کرتے آئے ہیں۔ پیغام پہنچ جانے کے بعد اسے تسلیم کرنا یا نہ کرنا متعلقہ قوم کا کام ہے‘ جس کے لیے ان کا ایک ایک فرد ہمارے سامنے جوابدہ ہے۔

آیت ۳۶ ﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ﴾ ''اور ہم نے تو ہر اُمت میں ایک رسولؑ بھیجا (اس پیغام کے ساتھ) کہ اللہ ہی کی بندگی کرو اور طاغوت سے بچو!''

طاغوت کا لفظ 'طغٰی' سے مشتق ہے جس کے معنی سرکشی کے ہیں۔ لہٰذا جو کوئی اللہ کی بندگی اور اطاعت سے سرکشی اور سرتابی کر رہا ہو' وہ طاغوت ہے' چاہے وہ انسان ہو یا جن' کسی ریاست کا کوئی ادارہ ہو' آئین ہو یا خود ریاست ہو۔ بہرحال جو بھی اللہ کی اطاعت سے سرتابی کر کے اس کی بندگی سے باہر نکلنے کی کوشش کرے گا' وہ گویا اللہ کے مقابلے میں حاکمیت کا دعویدار ہوگا اور اسی لیے طاغوت کے زمرے میں شمار ہوگا۔ طاغوت سے کنارہ کشی کا حکم سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۵۶ میں اس طرح آیا ہے: ﴿فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ؕ﴾ ''جس کسی نے کفر کیا طاغوت سے اور ایمان لایا اللہ پر تو یقیناً اس نے تھام لیا ایک مضبوط حلقہ جس کو ٹوٹنا نہیں ہے۔''

﴿فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ؕ﴾ ''تو اُن میں کچھ ایسے بھی تھے جنہیں اللہ نے ہدایت دے دی' اور کچھ وہ بھی تھے جن پر مسلط ہو گئی گمراہی۔''

﴿فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝۳۶﴾ ''تو تم گھومو پھرو زمین میں اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیسا انجام ہوا!''

تم اپنے تجارتی قافلوں کے ساتھ اصحابِ حجر کی بستیوں سے بھی گزرتے ہو' تم نے قومِ ثمود کے محلات کے کھنڈرات بھی دیکھے ہیں۔ تم قومِ مدین کے انجام سے بھی واقف ہو اور تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ سدوم اور عامورہ کی بستیوں کے ساتھ کیا معاملہ ہوا تھا۔ یہ تمام تاریخی حقائق تمہارے علم میں ہیں اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ ان سب کو کس جرم کی سزا بھگتنا پڑی تھی۔

آیت ۳۷ ﴿اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰىهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝۳۷﴾ ''(اے نبی ﷺ!) اگر آپ کو بہت خواہش ہے ان کی ہدایت کی تو یقیناً اللہ ہدایت نہیں دیتا اُسے جس کو وہ گمراہ کر دیتا ہے' اور ان کے لیے نہیں ہوں گے کوئی مددگار۔''

اس سلسلے میں اللہ کا قانون اٹل ہے۔ اللہ کی طرف سے لوگوں تک حق کی دعوت پہنچانے کا پورا بندوبست کیا جاتا ہے' ان پر ہدایت منکشف کی جاتی ہے اور بار بار انہیں موقع دیا جاتا

ہے کہ وہ سیدھے راستے پر آ جائیں۔ لیکن اگر کوئی شخص حق کو واضح طور پر پہچان لینے کے بعد ہر بار اسے رد کر دے تو اس سے ہدایت کی توفیق سلب کر لی جاتی ہے۔ پھر وہ حق کو پہچاننے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے اور اس کی گمراہی پر مہر تصدیق ثبت ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگوں ہی کے متعلق سورۃ البقرۃ کی آیت ۷ میں فرمایا گیا ہے: ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۖ﴾ ''اللہ نے مہر لگا دی ہے ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر' اور ان کی آنکھوں پر پردہ (پڑ چکا) ہے''۔ چنانچہ اسی قسم کے لوگوں کے بارے میں آیت زیر نظر میں فرمایا جا رہا ہے کہ اے نبی ﷺ! آپ کی شدید خواہش ہے کہ یہ لوگ ایمان لا کر راہِ ہدایت پر آ جائیں' مگر چونکہ یہ حق کو اچھی طرح پہچان لینے کے بعد اس سے روگردانی کر چکے ہیں اس لیے ان کی گمراہی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فیصلہ صادر ہو چکا ہے' اور اللہ کا اٹل قانون ہے کہ وہ ایسے گمراہوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ سورۃ القصص کی آیت ۵۶ میں اسی اصول کو واضح تر انداز میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے: ﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) بے شک آپ ہدایت نہیں دے سکتے جس کو آپ چاہیں بلکہ اللہ ہدایت دیتا ہے جس کو وہ چاہتا ہے۔''

آیت ۳۸ ﴿وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ ؕ﴾ ''اور وہ اللہ کی قسمیں کھا کر کہتے ہیں' اپنی پکی قسمیں کہ اللہ ہرگز نہیں اٹھائے گا اُس کو جو مر جائے گا۔''

مشرکینِ مکہ اگرچہ عمومی طور پر مرنے کے بعد دوسری زندگی کے قائل تھے مگر ان کا اس سلسلہ میں عقیدہ یہ تھا کہ جن بُتوں کی وہ پوجا کرتے ہیں وہ قیامت کے دن اللہ کے سامنے ان کے سفارشی ہوں گے اور اس طرح روزِ حشر کی تمام سختیوں سے وہ انہیں بچا لیں گے۔ لیکن ان کے ہاں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو بعث بعد الموت کا منکر تھا۔ ان لوگوں کے اس عقیدہ کا تذکرہ قرآن میں متعدد بار ہوا ہے۔ سورۃ الانعام میں ان لوگوں کا قول اس طرح نقل کیا گیا ہے: ﴿وَقَالُوْٓا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ۝۲۹﴾ ''اور وہ کہتے ہیں کہ نہیں ہے یہ ہماری زندگی مگر صرف دنیا کی اور ہم (دوبارہ) اٹھائے نہیں جائیں گے۔''

﴿بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۳۸﴾ ''کیوں نہیں' یہ وعدہ ہے اُس کے ذمہ سچا (کہ تم ضرور اٹھائے جاؤ گے) لیکن اکثر لوگ علم نہیں رکھتے۔''

آیت ۳۹ ﴿لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِيْ يَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ كَانُوْا

كٰذِبِيْنَ ﴿۳۹﴾ ’’تاکہ وہ واضح کر دے اُن پر وہ تمام چیزیں جن میں وہ لوگ اختلاف کرتے تھے اور اس لیے بھی کہ کفار جان لیں کہ وہی جھوٹے تھے۔‘‘

اللہ تعالیٰ پوری نوعِ انسانی کے ایک ایک فرد کو دوبارہ اٹھائے گا اور انہیں ایک جگہ جمع کرے گا۔ پھر ان کے تمام اختلافی نظریات وعقائد کے بارے میں حتمی طور پر انہیں بتا دیا جائے گا۔ چنانچہ اس وقت تمام منکرینِ حق کو اقرار کیے بغیر چارہ نہ رہے گا کہ ان کے خیالات و نظریات واقعی جھوٹ اور باطل پر مبنی تھے۔

آیت ۴۰ ﴿اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ﴿۴۰﴾﴾ ’’ہمارا قول تو کسی چیز کے بارے میں بس یہ ہوتا ہے‘ جب ہم اس کا ارادہ کرتے ہیں کہ ہم فرماتے ہیں اُسے ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔‘‘

اس نکتے کو اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ حکم عالمِ امر کے بارے میں ہے‘ جبکہ عالمِ خلق میں یوں نہیں ہوتا (عالم امر اور عالم خلق کے بارے میں وضاحت اس سورۃ کی آیت ۲ اور سورۃ الاعراف کی آیت ۵۴ کے ضمن میں گزر چکی ہے)۔ عالم امر میں کسی واقعے یا کسی چیز کے ظہور پذیر ہونے کے لیے اسباب‘ وسائل اور وقت درکار نہیں‘ بلکہ اللہ تعالیٰ ارادہ فرما کر کن فرماتے ہیں تو وہ چیز وجود میں آ جاتی ہے۔ عالم خلق میں بھی کلی اختیار تو اللہ ہی کا ہے مگر اس عالم کو عام طبعی قوانین کے مطابق چلایا جاتا ہے۔ چنانچہ عالم خلق میں کسی چیز کو وجود میں آنے اور مطلوبہ معیار تک پہنچنے کے لیے اسباب‘ وسائل اور وقت کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ کائنات اپنے تمام طبعی موجودات کے ساتھ عالم خلق کا اظہار ہے۔ آیت زیر نظر کے موضوع کی مناسبت سے یہاں میں کائنات کی تخلیق کے آغاز سے متعلق اپنی سوچ اور فکر کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔

کائنات کی تخلیق کے بارے میں ایک طرف تو پرانے فلسفیانہ تصورات ہیں اور دوسری طرف جدید سائنسی نظریات (theories)۔ فلسفیانہ تصورات کے مطابق سب سے پہلے وجودِ باری تعالیٰ سے عقلِ اوّل وجود میں آئی۔ عقلِ اوّل سے پھر فلکِ اوّل اور پھر فلکِ اوّل سے فلکِ ثانی وغیرہ۔ یہ مشّائین کے فلسفے ہیں جو ارسطو اور اس کے شاگردوں کے نظریات کے ساتھ دنیا میں پھیلے اور ہمارے ہاں بھی بہت سے متکلمین ان سے متاثر ہوئے۔ بہر حال جدید سائنسی انکشافات کے ذریعے ان میں سے کسی بھی نظریے کی کہیں کوئی تائید وتصدیق نہیں ہوئی۔

دوسری طرف جدید فزکس کے میدان میں اعلیٰ علمی سطح پر اس سلسلے میں جتنے بھی نظریات

(theories) ہیں اُن میں ’’عظیم دھماکے‘‘ (Big Bang) کا تصور پایا جاتا ہے۔ اس تصور کے تحت Big Bang کے نتیجے میں ارب ہا ارب درجہ حرارت کے حامل بے شمار ذرات وجود میں آئے۔ یہ ذرات تیزی سے حرکت کرتے ہوئے مختلف forms میں اکٹھے ہوئے تو کہکشائیں (galaxies) وجود میں آئیں اور چھوٹے بڑے بے شمار ستاروں کا ایک جہان آباد ہو گیا۔ انہی ستاروں میں ایک ہمارا سورج بھی تھا‘ جس کے اندر مزید ٹوٹ پھوٹ کے نتیجے میں اس کے سیارے (planets) وجود میں آئے۔ سورج کے ان سیاروں میں سے ایک سیارہ ہماری زمین ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ ٹھنڈی ہوتی رہی اور بالآخر اس پر نباتاتی اور حیوانی زندگی کے لیے سازگار ماحول وجود میں آیا۔ آج کی سائنس فی الحال ’’بگ بینگ‘‘ سے آگے کوئی نظریہ قائم کرنے سے قاصر ہے۔ اس نظریے سے جو معلومات سائنس نے اخذ کی ہیں وہ ان تمام حقائق کے ساتھ مطابقت (corroboration) رکھتی ہیں جن کا علم اس موضوع پر ہمیں قرآن سے ملتا ہے۔ اس سے پہلے مادے کے بارے میں سائنس قانون بقائے مادہ (Law of conservation of mass) کی قائل تھی کہ مادہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا‘ مگر نئے نظریے کو اپنا کر سائنس نے نہ صرف بگ بینگ کو کائنات کا نقطہ آغاز تسلیم کر لیا ہے بلکہ یہ بھی مان لیا ہے کہ مادہ ایک خاص وقت تک کے لیے ہے اور ایک خاص وقت کے بعد ختم ہو جائے گا۔

جہاں تک کائنات کی تخلیق کے آغاز کے بارے میں میری اپنی سوچ کا تعلق ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کی تخلیق اللہ تعالیٰ کے ایک امر ’’کُن‘‘ سے ہوئی (اللہ کے حکم سے‘ نہ کہ اس کی ذات سے)۔ پھر اس امر ’’کن‘‘ کا ظہور ایک خنک نور یا ٹھنڈی روشنی کی صورت میں ہوا (یہ خنک نور حرفِ کن کا ظہور تھا نہ کہ ذاتِ باری تعالیٰ کا)۔ اس روشنی میں حرارت نہیں تھی‘ گویا یہ مادی روشنی (material light) کے وجود میں آنے سے پہلے کا دور تھا۔ آج جس روشنی کو ہم دیکھتے یا پہچانتے ہیں اس میں حرارت ہوتی ہے اور اسی حرارت کی وجہ سے یہ material light ہے۔

امرِ ’’کُن‘‘ سے ظہور پانے والے اس خنک نور سے پہلے مرحلے پر ملائکہ کی پیدائش ہوئی۔ جیسے کہ مسلم شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے حدیث مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو نور سے پیدا کیا۔ اسی نور سے انسانی ارواح پیدا کی گئیں‘ اور سب سے پہلے روحِ محمدی ﷺ پیدا

کی گئی‘ جیسا کہ حدیث بیان کی جاتی ہے: ((اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ))(۱) یعنی اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے میرا نور پیدا کیا۔ ’’نُوری‘‘ اور ’’رُوحی‘‘ گویا دو مترادف الفاظ ہیں‘ کیونکہ روح کا تعلق بھی نور سے ہے۔ بہرحال یہ کائنات کی تخلیق کا مرحلہ اول ہے جس میں فرشتوں اور انسانی ارواح کی تخلیق ہوئی۔

اس کے بعد کسی مرحلے پر اس خنک نور میں کسی نوعیت کا زوردار دھماکہ (explosion) ہوا جس کو آج کی سائنس ’’بگ بینگ‘‘ کے نام سے پہچانتی ہے۔ اس دھماکے کے نتیجے میں حرارت کا وہ گولا وجود میں آیا‘ جو بہت چھوٹے چھوٹے ذرات پر مشتمل تھا۔ ان ذرات کا درجہ حرارت ناقابل تصور حد تک تھا۔ یہ گویا طبعی دنیا (Physical World) کا نقطہ آغاز تھا۔ اسی دور میں اس آگ کی لپٹ سے جِنّات پیدا کیے گئے اور انہی انتہائی گرم ذرات سے کہکشائیں‘ ستارے اور سیارے وجود میں آئے۔

ان سیاروں میں سے ایک سیارہ یا کُرّہ ہماری زمین ہے جو ابتدا میں انتہائی گرم تھی۔ اس کے ٹھنڈا ہونے پر اس کے اندر سے بخارات نکلے جو اس کے گرد ایک ہالے کی شکل میں جمع ہو گئے۔ ان بخارات سے پانی وجود میں آیا جو ہزار ہا برس تک زمین پر بارش کی صورت میں برستا رہا۔ اس کے نتیجے میں تمام روئے زمین پر ہر طرف پانی ہی پانی پھیل گیا۔ اُس وقت تک زمین پر پانی کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ یہی وہ دور تھا جس کا ذکر قرآن میں بایں الفاظ کیا گیا ہے: ﴿وَکَانَ عَرْشُہٗ عَلَی الْمَآءِ﴾ (ھود:۷) ’’کہ اُس کا عرش (اُس وقت) پانی پر تھا‘‘۔ پھر زمین جب مزید ٹھنڈا ہونے پر سکڑی تو اس کی سطح پر نشیب و فراز نمودار ہوئے۔ کہیں پہاڑ وجود میں آئے تو کہیں سمندر۔ اس کے بعد نباتاتی اور حیوانی حیات کا آغاز ہو۔ اس حیات کے ارتقاء کے بلند ترین مرحلے پر انسان کی تخلیق ہوئی اور حضرت آدمؑ کی روح ان کے وجود کو سونپی گئی۔ حضرت آدمؑ کی تاجپوشی کا یہی واقعہ ہے جہاں سے قرآن آدمؑ کی تخلیق کا تذکرہ کرتا ہے۔ اس لحاظ سے انسان اللہ تعالیٰ کی تخلیق کا اعلیٰ ترین شاہکار بھی ہے اور اس پوری کائنات کی تخلیق کا اصل مقصود و مطلوب بھی۔

(۱) اس روایت کو امام سیوطیؒ نے شرح الموافق میں نقل کیا ہے۔ محدثین کی تحقیق کے مطابق یہ حدیث موضوع ہے۔ تاہم اس کو استشہاداً ذکر کرنے والوں میں بڑے بڑے علماء شامل ہیں۔ مثلاً علامہ آلوسی نے روح المعانی میں اور ملا علی قاری نے المرقاۃ میں اسے ذکر کیا ہے۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر صاحبؒ کا استدلال بہرحال صحیح حدیث ((خُلِقَتِ الْمَلَائِکَۃُ مِنْ نُوْرٍ)) سے ہے اور یہ حدیث محض استشہاداً بیان کی گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحبؒ شاید اس حدیث کے موضوع ہونے سے واقف نہیں تھے‘ لہٰذا حاشیہ میں تصریح کرنا ضروری سمجھا گیا۔ (ادارہ)

یہاں ایک نکتہ یہ بھی سمجھ لیں کہ عالمِ خلق اور عالمِ امر بالکل الگ الگ نہیں ہیں۔ یعنی یوں نہیں کہا جا سکتا کہ یہاں تک تو عالم خلق ہے اور یہاں سے آگے عالم امر ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے‘ بلکہ یہ دونوں عالَم ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط اور باہم گندھے ہوئے ہیں۔ مثلاً اس عالم خلق میں تمام انسانوں کی ارواح موجود ہیں‘ جن کا تعلق عالم امر سے ہے: ﴿وَیَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ﴾ (بنی اسرائیل: ۸۵) یہ آیت واضح کرتی ہے کہ روح کا تعلق عالم امر سے ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہورِ زمانہ کتاب ’’حجۃ اللہ البالغہ‘‘ میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض نیک بندوں کی ارواح کو فرشتوں کے طبقۂ اسفل میں شامل کر لیتے ہیں‘ چنانچہ یہ نیک ارواح ان فرشتوں کے ساتھ سرگرم عمل رہتی ہیں جو اللہ کے احکام کی تعمیل و تنفیذ میں مصروف ہیں۔ اسی طرح فرشتے جو کہ عالم امر کی مخلوق ہیں وہ بھی یہاں عالم خلق میں ہمارے اردگرد موجود ہیں۔ دو دو فرشتے تو ہم میں سے ہر انسان کے ساتھ بطور نگران مقرر کیے گئے ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((مَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِیْ بَیْتٍ مِنْ بُیُوْتِ اللّٰہِ یَتْلُوْنَ کِتَابَ اللّٰہِ وَیَتَدَارَسُوْنَہٗ بَیْنَھُمْ اِلَّا نَزَلَتْ عَلَیْھِمُ السَّکِیْنَۃُ وَغَشِیَتْھُمُ الرَّحْمَۃُ وَحَفَّتْھُمُ الْمَلَائِکَۃُ وَذَکَرَھُمُ اللّٰہُ فِیْمَنْ عِنْدَہٗ))(۱)

’’اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں کچھ لوگ کتاب اللہ کی تلاوت اور اس کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے جمع نہیں ہوتے مگر یہ کہ ان کے اوپر سکینت نازل ہوتی ہے‘ اللہ کی رحمت انہیں ڈھانپ لیتی ہے‘ فرشتے ان کو گھیر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے مقربین (ملأ اعلیٰ) میں ان کا ذکر کرتا ہے۔‘‘

اس حدیث کی رو سے درسِ قرآن کی اس محفل میں یقیناً فرشتے موجود ہیں‘ وہ عالم امر کی شے ہیں‘ ہم نہ انہیں دیکھ سکتے ہیں نہ ان سے خطاب کر سکتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اہلِ ایمان جنّات بھی موجود ہوں اور قرآن سن رہے ہوں۔ چنانچہ ارواح‘ فرشتے اور وحی تینوں کا تعلق اگرچہ عالم امر سے ہے مگر ان کا عمل دخل عالم خلق میں بھی ہے۔ اس طرح عالم خلق اور عالم امر کو بالکل الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔

یہاں میں مرزا عبدالقادر بیدلؔ کے ایک مشہور شعر کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جو تخلیقِ کائنات اور تخلیق آدمؑ کے اس فلسفہ کو بہت خوبصورتی سے واضح کرتا ہے:

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار‘ باب فضل الاجتماع علی تلاوۃ القرآن وعلی الذکر۔

ہر دو عالمِ خاک شد تا بست نقشِ آدمی　　اے بہارِ نیستی از قدرِ خود ہشیار باش!

مرزا عبدالقادر بیدلؔ ہندوستان میں اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں تھے۔ وہ عظیم فلسفی اور فارسی کے بہت بڑے شاعر تھے۔ ان کا شمار دنیا کے چوٹی کے فلسفیوں میں ہوتا تھا۔ ان کی شاعرانہ عظمت کے سامنے مرزا غالب بھی پانی بھرتے اور ان کی طرز کو اپنانے میں فخر محسوس کرتے نظر آتے ہیں: ؎

طرزِ بیدلؔ میں ریختہ لکھنا　　اسدؔ اللہ خاں قیامت ہے!

موضوع کی اہمیت کے پیش نظر یہاں مرزا بیدلؔ کے مندرجہ بالا شعر کی وضاحت ضروری ہے۔ اس شعر میں وہ فرماتے ہیں ''ہر دو عالم خاک شد'' یعنی دونوں عالم خاک ہو گئے۔ شاعر کے اپنے ذہن میں اس کی وضاحت کیا تھی اس کے بارے میں شاعر خود جانتا ہے یا اللہ تعالیٰ —— لیکن میں اس سے یہ نکتہ سمجھا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے عالمِ امر کو تنزل کے مختلف مراحل سے گزار کر عالمِ خلق کی شکل دی۔ پھر اس کے مزید تنزلات کے نتیجے میں زمین (مٹی) پیدا کی گئی۔ گویا دونوں جہانوں نے خاک کی صورت اختیار کر لی' تب جا کر کہیں حیاتِ ارضی کا سلسلہ شروع ہوا اور پھر اس سلسلے میں ارتقا کا وہ بلند ترین مرحلہ آیا: ''تا بست نقشِ آدمی!'' جب آدمی کا نقش بننا شروع ہوا۔

دوسرے مصرعے میں (اے بہارِ نیستی از قدرِ خود ہشیار باش!) ''نیست'' کے فلسفے کو بھی اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ''وحدت الوجود'' کے فلسفے کے مطابق حقیقی وجود صرف اللہ کا ہے' باقی جو کچھ بھی ہمیں نظر آتا ہے اس میں سے کسی چیز کا وجود حقیقی نہیں ہے۔ گویا اللہ کے علاوہ اس کائنات کی ہر چیز ''نیست'' ہے ''ہست'' نہیں ہے:

کُلُّ مَا فِی الْکَوْنِ وَ ھْمٌ اَوْ خَیَالٌ　　اَوْ عُکُوسٌ فِی المَرَایَا اَوْ ظِلَال

یعنی اللہ کے وجود کے علاوہ جو وجود بھی نظر آتے ہیں وہ وہم ہیں یا خیالی تصویریں۔ اس طرح یہ تمام عالم گویا ''نیست'' ہے اور اس عالمِ نیست کی ''بہار'' انسان ہے' جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿خَلَقْتُ بِیَدَیَّ﴾ (صٓ:۷۵) کہ میں نے اسے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے۔ اللہ کا ایک ہاتھ گویا عالمِ امر اور دوسرا ہاتھ عالمِ خلق ہے۔ اس طرح انسان اللہ تعالیٰ کے عملِ تخلیق کا کلائمکس' مسجودِ ملائک اور خلیفۃ اللہ ہے۔ چنانچہ مرزا بیدلؔ فرماتے ہیں (اے بہارِ نیستی از قدرِ خود ہوشیار باش!) کہ اے انسان! اے اس عالمِ نیستی کی بہار! ذرا اپنے مقام و مرتبہ کو پہچانو! تمہیں وجود میں لانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہر دو عالم کو نہ جانے تنزلات کی کن کن منازل سے نیچے اُتار کر خاک کیا' تب کہیں جا کر تمہارا نقش بنا۔ ❁❁❁

تقویٰ اور اس کی عملی شکلیں

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

۴/ جنوری ۲۰۰۸ء کا خطبہ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴿۱۰۲﴾ (آل عمران)

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا وَّقُوْدُھَا النَّاسُ وَالْحِجَارَۃُ عَلَیْھَا مَلٰٓئِکَۃٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَآ اَمَرَھُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ﴿۶﴾ (التحریم)

عَنْ اَبِیْ مُحَمَّدٍ الْحَسَنِ بْنِ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ — سِبْطِ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ وَرَیْحَانَتِہٖ — رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا ۔ قَالَ : حَفِظْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ :

((دَعْ مَا یَرِیْبُکَ اِلٰی مَا لَا یَرِیْبُکَ)) (۱)

رسول اللہ ﷺ کے نواسے اور آپ کی خوشبو ابو محمد سیدنا حسن بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما سے روایت ہے‘ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان حفظ کر رکھا ہے:

’’جو بات تمہیں شک میں مبتلا کرے اسے ترک کر دو اور جس میں کوئی شک وشبہ نہ ہو اسے اختیار کرو۔‘‘

(۱) سنن الترمذی‘ ابواب صفة القیامة والرقائق والورع‘باب منه۔قال ابوعیسیٰ هذا حدیث حسن صحیح۔ وسسن النسائی‘کتاب الاشربة‘باب الحث علیٰ ترك الشبهات۔

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رضی اللہ عنہ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ :

((مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُہٗ مَا لَا یَعْنِیْہِ)) (۱)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے‘ وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

’’انسان کے حسن اسلام (یعنی اسلام کی خوبی) میں سے یہ بھی ہے کہ وہ ان کاموں کو ترک کر دے جن کا کوئی فائدہ نہیں۔‘‘

معزز سامعین کرام!

ان سلسلہ ہائے خطابات میں امام یحییٰ بن شرف النوویؒ کے شہرۂ آفاق مجموعہ احادیث ’’اربعین نووی‘‘ کا سلسلہ وار مطالعہ کرایا جا رہا ہے اور آج میں نے درسِ حدیث کے سلسلے کو آگے بڑھانا ہے — اس سے قبل ’’اربعین نووی‘‘ کی دس احادیث ہم پڑھ چکے ہیں اور آج ان شاء اللہ اس نشست ہم حدیث نمبر ۱۱ اور ۱۲ کا مطالعہ کریں گے — میرا معمول ہے کہ میں اکثر و بیشتر زیر مطالعہ حدیث سے متعلق کوئی قرآنی آیت ضرور تلاوت کرتا ہوں۔ آج میں نے جو آیات تلاوت کی ہیں ان کا مرکزی مضمون ہے: ’’تقویٰ‘‘۔

تقویٰ کے بارے میں قرآن کی تاکیدی آیت

تقویٰ کے بارے میں میرے نزدیک قرآن مجید کی سب سے زیادہ گاڑھی اور تاکیدی آیت سورۂ آل عمران کی آیت ۱۰۲ ہے‘ جس میں فرمایا گیا: ﴿**یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ**﴾ ’’اے ایمان والو! (ایمان کے دعوے دارو!) اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا کہ اُس کے تقویٰ کا حق ہے‘‘ — اس آیت کے نازل ہونے پر اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پریشان ہو گئے کہ کون ہے جو اللہ کے تقویٰ کا حق ادا کر سکے گا‘ کون ہے جو اللہ کی عبادت اور اللہ کی معرفت کا حق ادا کر سکے گا‘ جبکہ حضور اکرم ﷺ خود فرما رہے ہیں: **((مَا عَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ))** ’’اے رب! ہم تجھے پہچان نہیں پائے جیسا کہ تیرے پہچاننے کا حق تھا‘‘ **((وَمَا عَبَدْنَاکَ حَقَّ عِبَادَتِکَ))** ’’اور ہم تیری بندگی نہیں

(۱) سنن الترمذی‘ ابواب الزهد‘باب فیمن تکلم بکلمة یضحك بها الناس۔ ومسند احمد‘ کتاب مسند اهل البیت‘باب حدیث الحسین بن علی۔ح۱۶۴۶۔

کر پائے جیسا کہ تیری بندگی کا حق تھا‘‘ — ایک طرف حضور اکرم ﷺ کا یہ فرمان اور دوسری طرف سورۂ آل عمران کی مذکورہ آیت۔ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا گھبرانا بجا تھا کہ جب نبی اکرم ﷺ اللہ کی معرفت‘ عبادت اور تقویٰ حق ادا نہ کر سکے تو پھر اللہ کے تقویٰ کا حق کون ادا کر سکتا ہے!

میں بارہا عرض کر چکا ہوں کہ ہمارا قرآن کا پڑھنا‘ سننا کچھ اور طرح کا ہے‘ جبکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب قرآن پڑھتے یا سنتے تھے تو ان کا انداز کچھ اور ہوتا تھا۔ وہ قرآن کو پڑھتے اور سنتے ہوئے اپنے آپ کو تولتے رہتے تھے کہ ہم اس پر پورے اتر سکتے ہیں یا نہیں! اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کے پیش نظر ’’عمل‘‘ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم گھبرا گئے کہ اس آیت پر عمل کرنا اور اس پر پورا اُتر جانا تو ناممکنات میں سے ہے۔

اسی طرح جب سورۃ الانعام کی یہ آیت نازل ہوئی: ﴿فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۱﴾﴾ ’’اب دونوں فریقوں (یعنی ایک موحدین کا گروہ ہے اور ایک مشرکین کا‘ تو ان) میں سے امن کا مستحق کون ہے؟ (یعنی کس کو دلی اطمینان اور سکون حاصل ہوتا ہے؟ بتاؤ) اگر تم سمجھ رکھتے ہو!‘‘ — جیسا کہ قرآن مجید کا عام اسلوب ہے کہ پہلے سوال کیا جاتا ہے اور پھر جواب بھی اللہ خود دیتا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ سوال کرنے سے ذہن بیدار ہو کر غور و فکر شروع کر دیتا ہے اور پھر اس کے سامنے اصل جواب آ جاتا ہے۔ تو یہاں بھی اگلی آیت میں اس کا جواب دے دیا گیا — فرمایا:

﴿اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۸۲﴾﴾

’’وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان میں کسی ظلم کی آمیزش نہیں ہونے دی‘ اُن کے لیے امن ہے اور وہی ہدایت پانے والے ہیں۔‘‘

یہ سن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم گھبرا گئے اور حضور ﷺ سے کہنے لگے کہ ایسا کون شخص ہوگا جس کی زندگی کے اندر ظلم کی آمیزش نہ ہو۔ بسا اوقات ہم اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں‘ اپنے نفسوں پر زیادتی کر بیٹھتے ہیں یا بغیر کسی ارادے‘ نیت اور وجہ کے ہم کسی کے ساتھ ایسا معاملہ کر

بیٹھتے ہیں جو ظلم کے دائرے میں آتا ہے‘ تو پھر کون ہے جو ظلم سے بچے گا اور امن کا مستحق کون ہوگا؟ رسول اللہ ﷺ نے اس کے جواب میں فرمایا: یہاں ظلم سے مراد ’’شرک‘‘ ہے اور سورۂ لقمان کی آیت پڑھی: ﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۳﴾﴾ ’’یقیناً شرک بہت بڑا ظلم ہے‘‘۔ اس اعتبار سے سورۃ الانعام کی مذکورہ بالا آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ جو شخص ایمان لائے اور اپنے ایمان میں کسی قسم کے شرک کی آمیزش نہ ہونے دے تو اس کے لیے امن اور دلی سکون ہے۔

اسی طرح کا معاملہ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۰۲ کا تھا کہ صحابہؓ کو تشویش ہوئی کہ کون اللہ کے تقویٰ کا حق ادا کر سکتا ہے؟ مگر اس کے بعد جب سورۃ التغابن کی آیت: ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (آیت ۱۶) ’’اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا تمہاری استطاعت میں ہے‘‘ — نازل ہوئی تب صحابہ کو اطمینان ہوا کہ اپنی امکانی حد تک تو ہم اللہ کا تقویٰ اختیار کر سکتے ہیں۔ یعنی جتنی بھی ہمارے اندر طاقت ہے اس حد تک تو ہم اللہ کے تقویٰ کا حق ادا کر سکتے ہیں مگر یہ کہ اللہ کے تقویٰ کا حق ادا کرنا جیسا کہ اس کے ادا کرنے کا حق ہے‘ یہ بہرحال ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔

اسی طرح میں نے سورۃ التحریم کی یہ آیت بھی خطاب کے شروع میں تلاوت کی:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَیْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ ﴿۶﴾ (التحریم)

’’مؤمنو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آتش (جہنم) سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں اور جس پر تند خو اور سخت مزاج فرشتے (مقرر) ہیں‘ اللہ ان کو جو ارشاد فرماتا ہے وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم ان کو ملتا ہے وہ اسے بجا لاتے ہیں۔‘‘

اس آیت میں سب سے پہلے آتش جہنم سے اپنے آپ کو بچانے کا حکم ہے۔ چنانچہ حضور اکرم ﷺ اپنے خطبے میں فرمایا کرتے تھے: ((اُوْصِیْكُمْ وَنَفْسِیْ بِتَقْوَی اللّٰهِ

عزّوجلّ)) ’’میں تمہیں وصیت کر رہا ہوں اور اپنے نفس کو بھی کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو!‘‘

احادیث میں تقویٰ کی عملی شکلوں کا بیان

بعض احادیث میں تقویٰ کی عملی شکل سامنے آتی ہے اور آج ہمارے زیر مطالعہ جو دو احادیث ہیں ان میں بھی تقویٰ کی عملی شکل بیان ہوئی ہے۔ اس سے پہلے اربعین نووی کی حدیث ۶ میں بھی تقویٰ کی عملی شکل کا بیان تھا جس میں فرمایا گیا: ((اِنَّ الْحَلَالَ بَیِّنٌ ، وَاِنَّ الْحَرَامَ بَیِّنٌ ، وَبَیْنَھُمَا اُمُوْرٌ مُشْتَبِھَاتٌ لَا یَعْلَمُھُنَّ کَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ ، فَمَنِ اتَّقَی الشُّبُھَاتِ فَقَدِ اسْتَبْرَاَ لِدِیْنِہٖ وَعِرْضِہٖ)) یعنی حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے‘ لیکن ان دونوں کے مابین کچھ مشتبہات بھی ہیں‘ جن کے بارے میں کچھ شک سا ہو جاتا ہے کہ پتا نہیں یہ حلال ہیں یا حرام! اور ان کے حکم کے بارے میں قرآن یا سنت کی کوئی واضح نص موجود نہیں تو اب جو شخص واقعتاً تقویٰ کا حق —— کسی بھی درجے میں‘ چاہے وہ درجۂ استطاعت ہی کیوں نہ ہو —— ادا کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے لازم ہے کہ وہ شبہات کو ترک کر دے۔ یہ نہ ہو کہ مشکوک چیز سے یہ سوچ کر فائدہ اٹھائے کہ اس کی حرمت ثابت نہیں ہے۔ حالانکہ اگر دیکھا جائے تو قانون یہی ہے کہ جس شے کی حرمت ثابت نہیں وہ حلال اور مباح ہے۔ یعنی قانون کے دائرے کو تو وسعت دے دی گئی ہے‘ لیکن تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ جس کے حلال ہونے کا ثبوت نہیں ہے آپ اس سے بچ جائیں۔ لہٰذا جو شبہات سے بچ جائے گا وہ اپنے دین اور اپنی عزت و ناموس کو بچا لے گا۔ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ!

تقویٰ کا تقاضا: مشتبہات سے بچنا

اسی طرح آج جو دو احادیث ہمارے زیر مطالعہ ہیں ان میں بھی تقویٰ کی عملی شکل بیان ہوئی ہے۔ پہلی حدیث کے راوی رسول اللہ ﷺ کے چہیتے اور نہایت محبوب نواسے حضرت حسن رضی اللہ عنہ ہیں —— اس روایت میں حضرت حسنؓ کی کنیت بھی دی گئی اور ولدیت بھی: عَنْ اَبِیْ مُحَمَّدٍ الْحَسَنِ بْنِ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ۔ ابومحمد ان کی کنیت اور ولدیت علی بن ابی طالب ہے۔ اسی طرح روایت کے ابتدا میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے دو اوصاف

بھی بیان ہوئے ہیں: سِبْطِ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ وَرَیْحَانَتِہٖ یعنی حضرت حسن اللہ کے رسول ﷺ کے نواسے اور ان کی خوشبو ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ کی سیرت و کردار کو حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی شخصیت میں بھی محسوس کیا جا سکتا تھا —— آگے رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا میں تثنیہ کی ضمیر اس لیے استعمال کی گئی کہ حضرت حسن بھی صحابی ہیں اور آپ کے والد حضرت علی بھی صحابی ہیں۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حَفِظْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ : ’’میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے ایک بات یاد کر لی‘‘ وہ بات یہ ہے: ((دَعْ مَا یَرِیْبُكَ اِلٰی مَا لَا یَرِیْبُكَ)) ’’اُس چیز کو چھوڑ دو جو تمہارے دل میں شک پیدا کر دے اور اس چیز کو اختیار کرو جو تمہارے اندر شک پیدا نہ کرے‘‘۔ اس ضمن میں ہماری اردو زبان میں ایک اچھا لفظ ہے: ’’خلجان‘‘۔ اس اعتبار سے حدیث کا ترجمہ یوں ہوگا کہ جو چیز تمہارے دل میں ’’خلجان‘‘ پیدا کرے اسے چھوڑ دو۔ یعنی دل میں ایک خلجان سا ہے کہ میں جو کر رہا ہوں پتا نہیں یہ صحیح ہے بھی کہ نہیں‘ کہیں یہ حرام تو نہیں۔ تو اگر ایسا کوئی شک دل میں پیدا ہو گیا ہے تو اس کو چھوڑ دو۔

یہ حدیث اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ یہ اس بات کی ایک سند عطا کر رہی ہے کہ انسان کا ضمیر اور دل صحیح فتویٰ دیتا ہے۔ اس سے پہلے ہم پڑھ چکے ہیں کہ بسا اوقات حضور ﷺ سے کوئی صاحب مسئلہ پوچھتے تھے کہ میں یہ کروں یا نہ کروں تو آپؐ جواب میں فرماتے تھے: ((اِسْتَفْتِ قَلْبَكَ)) یعنی اپنے دل سے اس بارے میں فتویٰ لے لو! بظاہر یہ حکم عام معلوم ہوتا ہے‘ لیکن یہ عام نہیں خاص ہے۔ یہ صرف انہی لوگوں کے لیے ہے جن کے دلوں میں نورِ ایمان اور کامل یقین موجود ہے‘ جن کے دل کو ’’دلِ زندہ‘‘ کہا گیا ہے‘ اور دل زندہ وہ ہوتا ہے جس میں روحِ ربانی (جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے اندر پھونکی ہوئی ہے) زندہ ہے اور اس میں حرارت موجود ہے۔ الغرض قلب کے اندر اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت رکھی ہے کہ وہ آپ کو بتا سکتا ہے کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ اس اعتبار سے انسان کا ضمیر (conscience) ایک قسم کا جج ہے جو انسان کو غلط کام پر ملامت کرتا

ہے۔ اگر انسان کوئی غلط حرکت کر بیٹھا ہے‘ مثلاً وقتی طور پر کوئی جذبات کا طوفان آیا اور انسان اس میں بہہ گیا یا کسی ایسے ماحول میں بیٹھا ہوا تھا جہاں برائی غالب تھی تو وہ بھی غلط کام کر بیٹھا تو اندر سے دل اسے ملامت کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے لوگوں کو اکثر یہ کہتے ہوئے سنا ہوگا کہ میرا ضمیر مجھے کاٹ رہا ہے‘ مجھے ڈس رہا ہے۔

اسلام‘ ایمان اور یقین قلبی کی کیفیات

حدیثِ جبریل کے مطالعے کے دوران میں نے عرض کیا تھا کہ ایک ایمان وہ ہے جو اقرار باللسان کے درجے میں ہے‘ یعنی محض زبان سے شہادت (verbal attestation) ہے تو اس سے اسلام کا تقاضا تو پورا ہو گیا —— حدیث جبریل میں اسلام کے بارے میں کیے گئے سوال کے جواب میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اَلْاِسْلَامُ اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَّآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَتُقِيْمَ الصَّلَاةَ، وَتُؤْتِيَ الزَّكَاةَ، وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ، وَتَحُجَّ الْبَيْتَ اِنِ اسْتَطَعْتَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا))

’’اسلام یہ ہے کہ تو گواہی دے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں اور یہ کہ محمد (ﷺ) اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں‘ نماز ادا کرے‘ زکوٰۃ دے‘ رمضان کے روزے رکھے‘ اور استطاعت ہو تو بیت اللہ کا حج کرے۔‘‘

گویا ’’مسلمان‘‘ ہونے کے لیے ’’ایمان‘‘ لازمی نہیں ہے۔ جو بھی زبان سے کلمہ شہادت کا اقرار کرے گا تو وہ ہمارے ہاں مسلمان سمجھا جائے گا۔ اس لیے کہ ہمیں کیا پتا کہ اس کے دل میں ایمان ہے یا نہیں؟ ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ یا الیکٹرو کاڈیوگرام جیسا کوئی آلہ بھی نہیں ہے کہ دل میں اتار کر اس کا ایمان جانچ سکیں۔ لہٰذا اسلام کا دارو مدار اقرار باللسان پر ہے۔ یہ بہت اہم بات ہے۔ اکثر ہم ’’اسلام‘‘ اور ’’ایمان‘‘ کے مابین فرق نہ کرنے سے خلط مبحث کر جاتے ہیں۔ حدیث جبریل میں اسلام اور ایمان کی حقیقت کو علیحدہ علیحدہ کر کے بیان کیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے قرآن مجید کی اہم ترین آیت سورۃ الحجرات کی آیت ۱۴ ہے‘ جس میں فرمایا گیا:

﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ﴾

’’یہ بدو دعویٰ کر رہے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ (اے نبی ﷺ!) آپ ان سے فرما دیجیے کہ تم ہرگز ایمان نہیں لائے ہو‘ ہاں یوں کہہ سکتے ہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں (یعنی ہم نے اطاعت قبول کر لی ہے) جبکہ ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے۔‘‘

الغرض ایک ہے زبانی اقرار والا ایمان‘ جبکہ اس کے مقابلے میں ایک ہے دل کے اندر اُتر جانے والا ایمان۔ پھر اس ایمان کے بھی درجات ہیں‘ جو یقین کی کیفیات پر منحصر ہیں۔ ویسے یقین کی گہرائی کا تو ہم اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔ میں نے شاید پہلے بھی سلطان باہو کا ایک شعر آپ کو سنایا ہے —— مجھے پنجابی زیادہ نہیں آتی اور پنجابی صوفیاء کے کلام کا میں نے خاص مطالعہ بھی نہیں کیا‘ لیکن بعض چیزیں جو سننے میں آتی ہیں وہ واقعتاً محسوس ہوتی ہیں کہ بہت گہری باتیں ہیں —— سلطان باہو کہتے ہیں: ؎

دل دریا سمندروں ڈُونگھے کون دلاں دیاں جانے ہو!

یعنی دل کی گہرائی تو دریا بلکہ سمندر سے بھی زیادہ ہے۔ آپ کسی کے دل کا حال معلوم نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دل مسکن ہے روح کا اور روح کا تعلق تو ذاتِ باری تعالیٰ سے ہے: ﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۸۵﴾ (بنی اسراء یل) ’’(اے نبی ﷺ!) وہ آپ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ آپ کہہ دیجیے کہ روح میرے رب کے امر میں سے ہے اور تمہیں تو بہت ہی کم علم دیا گیا ہے‘‘۔ اس اعتبار سے دل کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات سے جڑ جاتا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہے جیسے سورج کی کرن سورج سے چل کر ہماری اس زمین تک آ گئی ہے اور اس نے زمین کو روشن کر دیا ہے‘ لیکن اس کا تعلق اللہ کے سورج سے ٹوٹا نہیں ہے۔ سورج کی کرن خط مستقیم میں سفر نہیں کرتی بلکہ قریب البیضوی (parabola) راستہ اختیار کرتی ہے۔ چنانچہ یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ اگر درمیان میں کوئی شے رکاوٹ نہ

بنے تو سورج کی کرن چکر کھا کے سورج میں واپس پہنچ جائے گی۔ یہ تو درمیان میں کوئی شے حائل ہوئی جس نے اسے واپس جانے سے روک لیا اور روکنے کی وجہ سے وہ شے منور ہوگئی۔ اگر کوئی شے درمیان میں نہ آئے تو وہ چلتی جائے گی اور ایک بہت بڑا چکر لگا کر‘ جس کا ہم اندازہ نہیں کر سکتے‘ یہ کرن واپس سورج میں پہنچ جائے گی۔ یہی معاملہ روح کا ہے اور وہ بھی درحقیقت انسان کے اندر ایک طرح کی روشنی ہے۔

قلب مؤمن میں موجود نورِ ایمان اور اس کی مثال

اس حوالے سے یہ بات جان لیجیے کہ جب انسان غلطی پر مصر رہتا ہے اور حرام خوری پر ڈیرے ڈال لیتا ہے تو پھر ایک وقت آتا ہے کہ یہ روشنی بجھ جاتی ہے اور پھر اس میں حق و باطل میں فرق کرنے کی صلاحیت نہیں رہتی۔ گویا وہ چراغ اندر سے بجھ گیا ہے یا اس کے اوپر اتنی سیاہی آ گئی ہے کہ اب اس کی روشنی باہر نہیں آ رہی۔ آج کل تو ہمیں اس کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا جبکہ پچھلے زمانے میں لالٹینیں ہوتی تھیں۔ اس کے اندر ایک شیشہ ہوتا تھا جو اس کی روشنی کو ہموار طریقے سے چاروں طرف پھیلا رہا ہوتا تھا۔ اگر لالٹین کے اس شیشے پر دھواں جم جائے تو شعلہ جلنے کے باوجود روشنی باہر نہیں آئے گی۔ یہی حال دل کا ہے کہ اگر گناہوں کی وجہ سے اس پر سیاہی جم جائے تو پھر اندر کی روشنی باہر نہیں آتی۔

یہ تو تمثیلات ہیں اور ایک ہی حقیقت کو واضح کرنے کے مختلف انداز ہو سکتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے گناہ کو سیاہ نکتے سے تعبیر فرمایا ہے جو بندۂ مؤمن کے دل پر لگ جاتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّ الْمُؤْمِنَ اِذَا اَذْنَبَ ذَنْبًا كَانَتْ نُكْتَةً سَوْدَاءَ فِي قَلْبِهٖ ، فَاِنْ تَابَ وَنَزَعَ وَاسْتَغْفَرَ صَقَلَتْ قَلْبَهٗ ، فَاِنْ زَادَ زَادَتْ حَتّٰى تُغْلِقَ قَلْبُه ، فَذٰلِكَ الرَّانُ الَّذِيْ قَالَ اللّٰهُ جَلَّ ثَنَاؤُهٗ : كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ○))(۱)

’’ایک مسلمان جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اُس کے دل پر ایک سیاہ نکتہ لگ جاتا ہے۔ پھر اگر وہ توبہ کر لے‘ باز آ جائے اور استغفار کرے تو یہ نکتہ اس کے دل سے

(۱) رواہ الترمذی فی السُّنن (ح:۳۳۳٤) وابن جریر الطبری فی التفسیر (۱٤۷/۱) واللفظ لہ۔

دور ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ (گناہوں میں) بڑھتا جائے تو یہ سیاہی بھی بڑھتی جاتی ہے‘ یہاں تک کہ اُس کا دل بند ہو جاتا ہے۔ پس یہی وہ زنگ ہے جس کے بارے میں اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا ہے: ’’ہرگز نہیں‘ بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال کی وجہ سے زنگ بیٹھ گیا ہے۔‘‘ (المطففین:۱٤)

ایک روایت میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی مٹھی بند کر کے دل کے بند ہو جانے کی تمثیل بیان فرمائی۔ یعنی اگر بند مٹھی میں کچھ روشنی ہے بھی تو وہ جسم کو منور نہیں کر سکتی۔ یہی تشبیہ دراصل سورۃ النور میں بیان ہوئی ہے:

﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ﴾ (آیت ۳۵)

’’اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ (بندۂ مؤمن کے قلب میں موجود) اُس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق ہے اور اس طاق میں ایک چراغ ہے‘ اور چراغ ایک شیشے میں ہے۔‘‘

اب آپ ذرا غور کیجیے اور اپنے جسم کی ہڈیوں کے پنجر کو اپنے تصور میں لائیے‘ تو سینے کی جو ہڈیاں اور پسلیاں ہیں وہ بالکل ایک طاق کے مانند ہیں۔ ’’ڈایا فرام‘‘ جو ہمارے سینے کو معدے وغیرہ سے جدا کرتا ہے‘ وہ اس کا فرش ہے اور اس پر قلب رکھا ہوا ہے۔ جب یہ قلب ایمان سے منور ہو جاتا ہے تو پھر یہ ایک روشن چراغ کے مانند ہے اور اس سے جو نور پھوٹتا ہے وہ پورے انسانی وجود کو روشن کر دیتا ہے۔ یہ ہے درحقیقت نورِ ایمان کی مثال۔ بعض لوگوں کو اس بارے میں مغالطہ ہوا ہے اور وہ اسے اللہ کے نور کی مثال سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ اصل میں نورِ ایمان کی مثال ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہاں ’’مَثَلُ نُوْرِهٖ‘‘ سے مراد ہے: ’’مَثَلُ نُوْرِهٖ فِيْ قَلْبِ الْمُؤْمِنِ‘‘ (اللہ کے نور کی مثال جو مؤمن کے قلب میں ہے)۔ گویا یہاں مراد ہے نورِ ایمان۔ اور ہر شخص جانتا ہے کہ ایمانِ حقیقی کے نور کا محل و مقام قلب ہے۔

گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے

''اربعین نووی'' کی زیر مطالعہ حدیث کے حوالے سے میں نے بتایا کہ یہ حدیث اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ یہ انسان کے ضمیر کو سند دے رہی ہے۔ اسی معاملہ کو ایک اور سطح پر محمد رسول اللہ ﷺ نے یوں بیان فرمایا:

((اَلْاِثْمُ مَا حَاكَ فِيْ صَدْرِكَ وَكَرِهْتَ اَنْ يَّطَّلِعَ عَلَيْهِ النَّاسُ)) (۱)

''گناہ وہ ہے جو تمہارے دل میں کھٹکے اور تمہیں یہ ناپسند ہو کہ وہ لوگوں کے علم میں آئے۔''

اس حدیث کے دوسرے ٹکڑے پر غور کیجیے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا اجتماعی ضمیر بھی ایک شے ہے —— جس طرح میرا اور آپ کا ایک انفرادی ضمیر ہے' اگر ایمان کی کوئی رمق ہمارے اندر موجود ہے تو وہ صحیح حکم لگاتا ہے کہ کیا اچھا ہے اور کیا برا۔ اسی طرح ایک نوعِ انسانی کا اجتماعی ضمیر ہے۔ نبی اکرم ﷺ اسے بھی سند دے رہے ہیں' بایں طور کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر آپ نے کوئی ایسا عمل کیا ہے جس کے بارے میں آپ نہیں چاہتے کہ لوگوں کے علم میں آئے تو یہ عمل گناہ ہے۔ چنانچہ اس حدیث کا پہلا جملہ —— ((اَلْاِثْمُ مَا حَاكَ فِيْ صَدْرِكَ)) ''گناہ وہ ہے جو تمہارے اپنے دل میں خلجان پیدا کر دے'' —— انسان کے انفرادی ضمیر سے متعلق ہے' جبکہ حدیث کا دوسرا جملہ —— ((وَكَرِهْتَ اَنْ يَّطَّلِعَ عَلَيْهِ النَّاسُ)) ''اور تم ناپسند کرو کہ وہ بات لوگوں کے علم میں آئے'' —— بنی نوع انسان کے اجتماعی ضمیر سے متعلق ہے۔ گویا نوعِ انسانی کا اجتماعی ضمیر بھی صحیح فیصلے کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے نیکی کے لیے ''مَعْرُوف'' اور بدی کے لیے ''مُنْکَر'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ معروف کا معنی ہے جانی پہچانی چیز جبکہ منکر سے مراد وہ چیز ہے جو انسان پہچان نہیں پاتا۔ چنانچہ فطرتِ انسانی کے نزدیک منکر اور بدی ایسی اجنبی چیز ہے جس سے اس کو دلچسپی نہیں ہے' اس کی پہچان اور اس کی راہ و رسم نہیں ہے۔ دوسری طرف نیکی اور معروف وہ ہے جسے انسان جانتا پہچانتا ہے' اس کی طرف

(۱) صحیح مسلم' کتاب البر والصلة والآداب' باب تفسیر البر والاثم۔

اسے رغبت ہوتی ہے اور اس کو وہ پسند کرتا ہے۔

یہاں یہ بھی نوٹ کر لیں کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر قرآن مجید کی بڑی اہم اصطلاح ہے' جو قرآن مجید میں کئی مقامات پر استعمال ہوئی ہے۔ مثلاً حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: ﴿يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (لقمٰن:۱۷) ''اے میرے بیٹے! نماز قائم کرو' نیکی کا حکم دو اور برائی سے منع کرو''۔ دین اسلام میں ایسا نہیں ہے کہ دو ہزار چیزوں کی لمبی فہرست دے کر بتا دیا گیا ہو کہ یہ برائیاں ہیں اور ایک ہزار چیزوں کی فہرست دے کر بتا دیا گیا ہو کہ یہ اچھائیاں ہیں' بلکہ اللہ تعالیٰ نے انسانی ضمیر کے اندر الہامی طور پر نیکی اور بدی کا علم ودیعت کر دیا ہے۔ تو انسان کی فطرت (nature) جانتی ہے کہ کیا خیر ہے اور کیا شر' کیا فجور ہے اور کیا تقویٰ ہے۔ اس حوالے سے سورۃ الشّمس میں فرمایا گیا:

﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝۷ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝۸ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝۹ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝۱۰﴾

''اور نفس انسانی کی (قسم) اور جیسا کچھ اس کو سنوارا۔ پھر اس کی بدکاری اور اس کی پرہیزگاری (دونوں) کی اسے سمجھ دی۔ پس جس نے (اپنے) نفس (یعنی روح) کو (برائیوں سے) پاک رکھا وہ مراد کو پہنچا' اور جس نے اسے خاک میں ملایا (یعنی بدکاریوں میں پڑ گیا تو) وہ خسارے میں رہا۔''

تقویٰ کی عملی شکل: لغو کاموں سے اعراض

اب ہم اربعین نووی کی حدیث ۱۲ کا مطالعہ کرتے ہیں — یہ حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور یہ حدیث حسن ہے جسے امام ترمذی نے اپنی ''سنن'' میں روایت کیا ہے —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهٗ مَا لَا يَعْنِيْهِ))

''انسان کے اسلام کا حسن اس میں بھی ہے کہ وہ ہر اُس چیز کو چھوڑ دے جس کا اسے کوئی فائدہ نہ ہو۔''

اس حدیث پر بڑے غور وفکر کی ضرورت ہے—— حُسْنِ الْاِسْلَامِ یعنی اسلام کی خوبی کے بارے میں تو ہم نے حدیث جبریل کی روشنی میں تفصیل سے پڑھا تھا۔ درحقیقت اسلام ہی کو خوبصورت بنانا ہے۔ مثال کے طور پر نماز اسلام کا ایک رکن ہے۔ جب ایمان اور قلبی یقین آ گیا تو نماز کی کوئی اور ہی شان ہو جائے گی۔ پھر جب قلبی یقین مزید گہرا ہو گیا تو اب وہ نماز ''معراج المؤمنین'' بن جائے گی۔ یعنی چیز وہی ہے مگر اس کا روپ' اس کا رنگ' اس کی شان' اور اس کا حسن ایمان کے ساتھ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اسی کا نام ''حسن الاسلام'' ہے اور اسی کو تصوف سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

تصوف کے موضوع پر میرا ایک چھوٹا سا کتابچہ ہے: ''مروجہ تصوف یا احسانِ اسلام'' —— تصوف کے ایک معنی تو وہ ہیں جو آج کل ہمارے ہاں معروف ہیں یعنی مروجہ تصوف' جبکہ ایک تصوف ہے قرآن' حدیث' محمد ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا۔ اس تصوف کے لیے لفظ ''احسان'' یا ''حسن اسلام'' استعمال کیجیے۔ وہ تصوف ہے: اسلام میں حسن اور خوبی کا پیدا ہو جانا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تصوف اسلام سے علیحدہ کوئی شے ہے' بلکہ اسلام کے اندر ایک خوبی' ایک حسن اور ایک دلربائی کا پیدا ہو جانا تصوف ہے اور اس کیفیت کا اصل نام ''احسان'' ہے۔ احسان کے بارے میں بھی ہم حدیث جبریل میں تفصیل سے پڑھ چکے ہیں۔

دنیا آخرت کی کھیتی ہے

زیر درس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کسی انسان کے اسلام کی خوبی' بہتری' اس کے حسن اور درجے کے بلند ہونے میں یہ چیز بھی شامل ہے کہ وہ ہر اُس چیز کو چھوڑ دے جو اس کے لیے کوئی مفید و نفع بخش نتیجہ برآمد نہ کرتی ہو۔ اس کا مطلب سمجھ لیجیے۔ دیکھئے ہماری زندگی بڑی محدود سی ہے۔ آج کل کی اوسط عمر تقریباً ۶۰ سال ہے۔ ان ۶۰ سالوں میں پہلا دور یوں گزر گیا کہ ابھی پورا شعور نہیں تھا اور بعد میں پھر ایک ایسا دور آ گیا کہ ''لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا'' کے مصداق اس کے حواس پوری طرح برقرار نہیں رہے۔ ان دونوں اَدوار کے درمیان میں تیس چالیس برس کا عرصہ ہے جس

میں انسان باشعور ہے اور وہ اپنے ارادے' عزم اور منصوبہ بندی کے مطابق فیصلے اور عمل کرتا ہے۔ اس دور میں کیے گئے اَعمال واَفعال کے نتائج لامتناہی زندگی یعنی آخرت میں نکلنے ہیں۔ جو یہاں کمائیں گے وہی آخرت میں پائیں گے۔ چنانچہ دنیا کو آخرت کی کھیتی کہا جاتا ہے۔ (اَلدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ)۔ یہاں بوؤ گے تو وہاں کاٹو گے' اور اگر یہاں کچھ بویا ہی نہیں تو وہاں کیا کاٹو گے؟ اگر یہاں کانٹے بوئے ہیں تو وہاں کانٹے ہی کاٹنے پڑیں گے اور اگر یہاں پھل دار اور پھول دار درخت لگائے ہیں تو وہاں پر بھی آپ کو پھل دار اور پھول دار درخت ہی ملیں گے۔ اگر آپ نے دنیوی زندگی میں نیکیاں کمائی ہیں تو وہاں نیکی کا بدلہ انعامات کی صورت میں ملے گا اور اگر اس حیاتِ ارضی میں بدیاں کمائی ہیں تو ظاہری بات ہے کہ ان کی سزا عذاب کی صورت میں ملے گی۔

یہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے اور اس محدود زندگی میں ہمارے پاس جو بھی وقت ہے' اسی میں ہمیں سب کچھ بنانا ہے۔ تو کیا کوئی عقل وشعور رکھنے والا شخص اس محدود سی زندگی میں سے کسی وقت کا ضائع کرنا گوارا کرے گا؟ اس کا ہر لمحہ ''اَمر'' ہے—— ''اَمر'' ہندی کا لفظ ہے جس کا معنی ہے ''نہ ختم ہونے والا''۔ جب گاندھی جی مرے تھے تو انڈین ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر اُس وقت کہا گیا تھا: ''گاندھی جی امر ہو گئے'' اور یہاں کسی نے بے نظیر بھٹو کے بارے میں بھی کہا ہے کہ وہ امر ہو گئیں۔ یہ ہندوانہ تصور ہے۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ مرنے کے بعد جو زندگی شروع ہونی ہے اس کے لیے موت نہیں ہے۔ ہر شخص مرنے کے بعد اَمر ہو جائے گا' کیونکہ اب کوئی اور موت تو آئے گی نہیں۔ اب تو بس یہی ہے کہ مرنے کے فوراً بعد آپ عالَمِ برزخ میں داخل ہوں گے اور ایک وقت آئے گا کہ عالَمِ برزخ سے عالَمِ آخرت میں منتقل ہو جائیں گے۔

دُنیوی زندگی دیباچہ اور اُخروی زندگی اصل کتاب ہے

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آخرت کی زندگی لامتناہی (infinite) ہے' یعنی وہ زندگی محدود نہیں' لامحدود ہے' جبکہ ہماری یہ دُنیوی زندگی متناہی (finite)' محدود اور بہت چھوٹی ہے۔ اس حوالے سے میں ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ ہم آخرت پر ایمان

رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اگر آپ آخرت کے حوالے سے اپنے ذہن کا جائزہ لیں گے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے ذہنوں میں دنیوی اور اُخروی زندگیوں کا نسبت وتناسب (ratio proportion) ایسا ہے کہ جیسے اصل کتاب تو یہ دنیا کی زندگی ہے' اور آخرت کی حیثیت کتاب کے آخر میں لگے ایک چھوٹے سے ضمیمہ (appendix) کی ہے—— ایک تو وہ لوگ ہیں جو آخرت کو مانتے ہی نہیں' ان سے قطع نظر' جو مانتے ہیں ان کا ماننا بھی اس درجے میں ہوتا ہے کہ وہ اس دُنیوی زندگی کو اصل کتاب مانتے ہیں اور آخرت کو کتاب کے ساتھ لگا ہوا ایک ضمیمہ' جو اصل کتاب کا بمشکل دو فیصد ہوتا ہے۔ حالانکہ حیاتِ دنیوی کی حیثیت کتاب کے دیباچے کی ہے' جبکہ اصل کتابِ زندگی تو کھلے گی موت کے بعد' جیسے سورۃ العنکبوت میں فرمایا: ﴿وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۴﴾﴾ ''درحقیقت آخرت کا گھر ہی اصل زندگی ہے۔ کاش وہ جانتے!''—— غزوۂ احزاب میں رسول اللہ ﷺ نے خندق کی جاں گسل کھدائی میں مصروف صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو دیکھ کر فرمایا تھا:

((اَللّٰهُمَّ لَا عَيْشَ اِلَّا عَيْشُ الْاٰخِرَةِ ۔ فَاغْفِرْ لِلْاَنْصَارِ وَالْمُهَاجِرَةِ!))

''اے اللہ! آخرت کی زندگی ہی اصل زندگی ہے' جبکہ یہ زندگی کوئی زندگی ہی نہیں ہے' پس تو (اپنے راستے میں جہاد وقتال میں مصروف) انصار ومہاجرین کی مغفرت فرما دے!'' (بخاری ومسلم)

دنیوی واُخروی زندگی کے مابین نسبت وتناسب کے اعتبار سے' اب یا تو ہم وہ کام کریں جس سے دنیا کی کوئی ضرورت پوری ہو رہی ہو —— اس میں ''طولِ امل'' نہیں ہونا چاہیے کہ دنیا کی خواہشات ربڑ کی طرح پھیلتی چلی جائیں۔ تعیش' فراوانی اور زیادہ سے زیادہ سہولتیں ضروریات (necessities) میں نہیں آتیں۔ لہٰذا وہ کام کرو جس سے یا تو دنیا کی کوئی ضرورت پوری ہو یا آخرت کے اندر انسان کو اس کا اجر وثواب مل سکے۔ ان دو کے علاوہ کسی تیسرے کام کے لیے زندگی کا کوئی لمحہ ضائع کرنا ایمان اور اسلام کے منافی ہے۔ اگر آپ کوئی لمحہ کسی فضول اور بے کار کام میں ضائع کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ آپ کو آخرت پر یقین ہی نہیں۔

بے فائدہ کاموں سے اجتناب: شیوۂ مؤمن

یہی وجہ ہے کہ سورۃ المؤمنون میں کامیاب ہونے والے اہل ایمان کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا: ﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ﴿۱﴾ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ﴿۲﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۙ﴿۳﴾﴾ ''بے شک ایمان والے کامیاب ہو گئے' جو اپنی نماز میں عجز و نیاز کرتے ہیں' اور جو بے ہودہ باتوں سے منہ موڑے رہتے ہیں''۔ لغو کام اسے کہتے ہیں جو بے فائدہ ہو' مثلاً بیٹھے تاش یا شطرنج کھیل رہے ہیں۔ بھئی کونسی تمہاری دنیا کی ضرورت اس سے پوری ہوئی یا تم نے اس سے آخرت کا کیا کمایا؟ اس ضمن میں ایک اصطلاح ہمارے ہاں ''وقت گزاری'' (یا to kill the time) استعمال ہوتی ہے' حالانکہ یہ وقت اتنی حقیر شے نہیں ہے کہ اسے یونہی ضائع کر دیا جائے۔ وقت گزاری کے مشغلے انہی کے لیے ہوں گے جن کو آخرت پر یقین نہیں ہے' ورنہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی صاحب ایمان اپنا وقت یونہی ضائع کر دے۔ اگر آپ کو وقت ملا ہے تو سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ اور سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ کا ورد کیجیے۔ ان میں سے ہر کلمہ آپ کے لیے جنت میں پودا بن جائے گا اور وہاں آپ کو سرسبز باغات ملیں گے' لہٰذا وقت ضائع کیوں کر رہے ہو؟ یا تو کسی ایسے کام میں مصروف ہو جاؤ جس سے دنیا کی کوئی ضرورت پوری ہو رہی ہو؟ یا پھر آخرت کے کمانے کے لیے لگ جاؤ' تیسرا کام نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے ایمان والوں کی صفت بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۙ﴿۳﴾﴾ یعنی اہل ایمان تو وہ لوگ ہیں جو لغو اور بے فائدہ کاموں سے مکمل اجتناب برتتے ہیں۔

آپ میں سے بہت سے حضرات کے علم میں ہوگا کہ سورۃ المؤمنون کی ابتدائی گیارہ آیات کے ہم معنی اور بہت مشابہ سورۃ المعارج کی آیات ہیں۔ سورۃ المعارج میں ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۙ﴿۳﴾﴾ کے بجائے ﴿وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۲۶﴾﴾ کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی کامیاب ہونے والے وہ لوگ ہیں جو آخرت' قیامت کے دن' جزا و سزا اور حساب و کتاب کو مانتے ہیں اور اس پر یقین رکھتے

ہیں۔آیات کی اس ترتیب سے مفہوم یہ بنے گا کہ جزا وسزا کے قانون پر ایمان رکھنے والوں کے لیے کیسے ممکن ہے کہ وہ کسی لغو کام کے اندر اپنا وقت صرف کریں! بلکہ سورۃ الفرقان میں ''عباد الرحمٰن'' کی صفات کا تذکرہ کرتے ہوئے تو یہاں تک فرمایا گیا: ﴿وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا﴾ ''اور جب انہیں بے ہودہ چیزوں کے پاس سے گزرنے کا اتفاق ہوتو باوقار انداز سے گزر جاتے ہیں''۔یعنی خود لغو کام میں ملوث ہونا تو بہت دور کی بات ہے' اگر کہیں اتفاق سے لغو کام کرتے لوگوں کے پاس سے گزر ہو جائے تو وہ متوجہ ہوئے بغیر گزر جاتے ہیں۔مثلاً آپ کسی کام سے جا رہے ہیں اور آپ نے دیکھا کہ سڑک پر لوگ جمع ہیں۔کوئی کھیل تماشا ہے' کوئی مداری ہے جو کرتب دکھا رہا ہے' لوگوں کی دل لگی کا سامان کر رہا ہے' وغیرہ۔اب اگر آپ اس طرف متوجہ ہو جائیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے وقت کی قدر و قیمت کو نہیں سمجھا' جبکہ عباد الرحمٰن کا شیوہ یہ ہے کہ اوّل تو وہ بالارادہ کسی لغو کام کی طرف جاتے نہیں اور اگر اتفاقاً کسی لغو کے پاس سے گزر ہو جائے تو وہ وہاں سے باعزت طریقے سے گزر جاتے ہیں اور اس طرف متوجہ نہیں ہوتے۔یعنی اپنے وقت کا کوئی منٹ بھی ضائع کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔

جوامع الکلم احادیث کو یاد کیجیے!

یہ احادیث بڑی چھوٹی چھوٹی ہیں' لیکن ان میں معانی کا ایک جہان پوشیدہ ہے۔یہی وہ احادیث ہیں جن کو ''جوامع الکلم'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ان مختصر احادیث کو یاد کر لینا آسان ہے' لہٰذا ان کو ضرور یاد کرنا چاہیے۔آج کی اس نشست میں اربعین نووی کی دو احادیث ہمارے زیر مطالعہ آئیں اور ان کے ضمن میں ایک اور بہت اہم حدیث کا بھی تذکرہ ہوا۔میں امید کرتا ہوں کہ آپ ان احادیث کو ذہن نشین کر لیں گے۔آپ کی آسانی کے لیے میں وہ تینوں احادیث ایک بار پھر دہرا دیتا ہوں۔

(۱) ((دَعْ مَا يَرِيْبُكَ اِلٰى مَا لَا يَرِيْبُكَ))

''جس چیز سے دل میں خلجان پیدا ہو جائے اسے چھوڑ دو اور وہ چیز اختیار کرو جس سے دل میں اطمینان ہو۔''

(۲) ((اَلْاِثْمُ مَا حَاكَ فِيْ صَدْرِكَ وَكَرِهْتَ اَنْ يَّطَّلِعَ عَلَيْهِ النَّاسُ))

''گناہ وہ ہے جو تمہارے دل میں خلجان پیدا کرے اور تم ناپسند کرو کہ یہ لوگوں کے علم میں آئے۔''

(۳) ((مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهٗ مَا لَا يَعْنِيْهِ))

''کسی انسان کے اسلام کی خوبی میں یہ بھی شامل ہے کہ کسی لایعنی کام میں وقت ضائع نہ کرے۔''

یعنی انسان کے اسلام کے اندر جو حسن پیدا ہوا ہے اگر وہ اسلام اور ایمان سے گزر کر احسان کے درجے تک آ گیا ہو تو پھر اسے چاہیے کہ وہ اپنا وقت یا تو ایسے کام میں صرف کرے جس سے دنیا کی کوئی ضرورت (necessity) پوری ہو رہی ہو —— اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دنیا کے اندر اپنی جائیداد بڑھاتے چلے جانا' کاروبار پھیلاتے چلے جانا اور اپنے لیے لذاتِ دُنیوی اور عیاشی کے سامان فراہم کرنا' بلکہ ایسا کام ہو جس سے دنیا کی ضرورت پوری ہو —— یا پھر ایسے کام میں جو انسان کے لیے آخرت کا تحفہ بن جائے' آخرت کا خزانہ بن جائے —— اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے' آمین یا ربّ العالمین!

اقول قولی هذا واستغفر اللّٰه لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

(مرتب: حافظ محمد زاہد' ادارتی معاون)

دعوت رجوع الی القرآن کی اساسی دستاویز
ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی مقبولِ عام تالیف
مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق
اشاعت خاص: 45 روپے اشاعت عام: 25 روپے

ذکرِ الٰہی: اطمینانِ قلب کا ذریعہ

عتیق الرحمٰن صدیقی

﴿اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۝۲۸﴾ (الرعد)

''وہ لوگ جو ایمان لائے اور ان کے دل اللہ کے ذکر سے مطمئن ہوتے ہیں۔ آگاہ ہو جاؤ! اللہ کے ذکر کے ساتھ ہی دل مطمئن ہوتے ہیں۔''

''ذکر'' کا معنی و مفہوم

اس آیۂ کریمہ میں دو لفظ غور طلب ہیں' ایک ہے ذکر اور دوسرا ہے تَطْمَئِنُّ۔ صاحبِ مفردات القرآن لفظ ''ذکر'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''الذکر کبھی تو اس ہیئت نفسانیہ پر بولا جاتا ہے جس کے ذریعہ سے انسان اپنے علم کو محفوظ رکھتا ہے۔ یہ قریباً حفظ کے ہم معنی ہے مگر حفظ کا لفظ احراز (مضبوط کرنا' جمع کرنا) کے لحاظ سے بولا جاتا ہے اور ذکر کا لفظ استحضار کے لحاظ سے۔ اور کبھی ذکر کا لفظ دل یا زبان پر کسی چیز کے حاضر ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس بنا پر بعض نے کہا ہے کہ ذکر دو قسم پر ہے: ذکر قلبی اور ذکر لسانی۔ پھر ان میں سے ہر ایک دو قسم پر ہے: نسیان کے بعد کسی چیز کو یاد کرنا یا بغیر نسیان کے کسی کو ہمیشہ یاد رکھنا۔ اور ہر قول کو ذکر کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ذکر لسانی کے بارے میں فرمایا: ﴿لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ؕ﴾ (الانبیاء: ۱۰) ''ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں تمہارا تذکرہ ہے''۔ ﴿وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ؕ﴾ (الانبیاء: ۵۰) ''اور یہ مبارک نصیحت ہے جسے ہم نے نازل فرمایا ہے۔'' (مفردات القرآن' علامہ راغب اصفہانی)

ذکر اور اس کے مشتقات' قرآن میں

لفظ ''ذکر'' اور اس کے مشتقات قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر استعمال ہوئے ہیں'

کسی جگہ اس سے مراد قرآن مجید ہے اور کسی مقام پر یہ نصیحت کے معنی دیتا ہے۔ فرمایا:

﴿فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى ۙ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا۝۲۹﴾ (النجم)

''پس (اے نبی ﷺ!) جو شخص ہمارے ذکر سے منہ پھیرتا ہے اور دنیا کی زندگی کے سوا جسے کچھ مطلوب نہیں (اسے اس کے حال پر چھوڑ دو)۔''

یعنی مادہ پرست اور خدا بیزار انسانوں پر اپنی محنت صرف کرنے کے بجائے آپؐ ان لوگوں کی طرف توجہ مبذول کریں جو اللہ کا ذکر سننے کے لیے آمادہ و تیار ہوں۔ سورۃ الطلاق میں فرمایا:

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۚ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا۝۱۰﴾

''پس اللہ سے ڈرو اے صاحب عقل لوگو جو ایمان لائے ہو۔ اللہ نے تمہاری طرف ایک نصیحت نازل کر دی ہے۔''

یہاں ذکر سے مراد نصیحت یعنی قرآن مجید ہے' جبکہ اس سے اگلی آیت میں نصیحت سے مراد خود حضور نبی کریم ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے جو ہمہ تن نصیحت تھی۔

ذکر کا مفہوم یادِ الٰہی کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ فرمایا: ﴿اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ﴾ (الحدید: ۱۶) ''کیا ایمان لانے والوں کے لیے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر سے پگھلیں اور اس کے نازل کردہ حق کے آگے جھکیں!'' یعنی جب کفر کی طاقتیں مٹھی بھر مسلمانوں کو مشق ستم بنا رہی ہیں اور اہل ایمان بے سروسامانی کی حالت میں پناہ کے لیے مدینہ منورہ کا رخ کر رہے ہیں' جب حالات کی نزاکت اپنی آخری حدوں کو چھو رہی ہے تو کیا اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ اللہ کا ذکر سن کر تمہارے دل پگھلیں اور تمہارے دلوں میں ایثار و قربانی اور سرفروشی کا جذبہ پیدا ہو! یہاں مسلمانوں کا وہ خاص گروہ مراد ہے جس نے ایمان کا اقرار تو کر لیا تھا مگر اسلام کے درد سے ان کے دل خالی تھے۔

ذکرِ الٰہی سے تغافل اصل خسارہ ہے

اللہ کے ذکر یعنی اس کی یاد سے تغافل مؤمن کے لیے اصل خسارہ اور بڑے گھاٹے اور نقصان کا سودا ہے۔ فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۝۹﴾ (المنٰفقون)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تمہارے مال اور تمہاری اولادیں تم کو اللہ کی یاد سے غافل نہ کردیں۔ اور جو لوگ ایسا کریں گے وہی خسارے میں رہنے والے ہیں۔''

گویا مال اور اولاد کی خاطر ایمان کے تقاضوں سے انحراف ضعف ایمان اور فسق و نافرمانی میں مبتلا ہونے کے مترادف ہے۔ یہ کیفیت خدا کی یاد سے غفلت کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوتی ہے اور یہی خرابیوں کی اصل جڑ ہے۔ فلاح و کامرانی انہی اہل ایمان کا مقدر ہے جو اللہ کو کثرت سے یاد کرتے ہیں اور کاروبار میں لگ کر بھی اسے بھولتے نہیں ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۱۰﴾ (الجمعة)

''پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہو شاید کہ تمہیں فلاح نصیب ہو جائے۔''

کثرتِ ذکر

سورۃ الاحزاب میں مسلم اور مؤمن مردوں اور عورتوں کی جو صفات بیان کی گئی ہیں ان میں ایک اہم صفت یہ بھی ہے:

﴿... وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝۳۵﴾

''.....اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے مرد اور عورتیں، اللہ نے ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔''

صاحبِ تفہیم القرآن نے آیت کے اس حصے پر نہایت خوبصورت اور جامع نوٹ لکھا ہے، وہ رقم طراز ہیں:

''اللہ کو کثرت سے یاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کی زبان پر ہر وقت زندگی کے ہر معاملے میں کسی نہ کسی طرح خدا کا نام آتا رہے۔ یہ کیفیت آدمی پر اس وقت تک طاری نہیں ہوتی جب تک اس کے دل میں خدا کا خیال بس کر نہ رہ گیا ہو۔ انسان کے شعور سے گزر کر اس کے تحت الشعور اور لاشعور تک جب یہ خیال گہرا اتر جاتا ہے تب ہی اس کا یہ حال ہوتا ہے کہ جو کام اور جو بات بھی وہ کرے گا اس میں خدا کا نام ضرور آئے گا۔ کھائے گا تو بسم اللہ کہہ کر کھائے گا، فارغ ہوگا تو الحمد للہ کہے گا، سوئے گا تو اللہ کو یاد کر کے اور اٹھے گا تو اللہ ہی کا نام لیتے ہوئے..... اپنے ہر معاملے میں اللہ سے مدد مانگے گا، ہر نعمت ملنے پر اُس کا شکر ادا کرے گا، ہر آفت آنے پر اُس کی رحمت کا

طلب گار ہوگا، ہر مشکل میں اُس سے رجوع کرے گا..... غرض اٹھتے بیٹھتے اور دنیا کے سارے کام کرتے اُس کا وظیفہ خدا ہی کا ذکر ہوگا۔ یہ چیز دراصل اسلامی زندگی کی جان ہے..... خود عبادت اور دینی کاموں میں بھی جان اسی چیز سے پڑتی ہے کہ آدمی کا دل محض ان خاص اعمال کے وقت ہی نہیں بلکہ ہمہ وقت خدا کی طرف راغب ہو اور اس کی زبان دائماً اُس کے ذکر سے تر رہے..... اس کے برعکس جو زندگی دائمی ذکرِ خدا سے خالی ہو اس میں محض مخصوص اوقات میں یا مخصوص مواقع پر ادا کی جانے والی عبادات اور دینی خدمات کی مثال اس پودے کی سی ہے جو اپنے مزاج سے مختلف آب و ہوا میں لگایا گیا ہو اور محض باغبان کی خاص خبر گیری کی وجہ سے پل رہا ہو۔ اس بات کو نبی ﷺ ایک حدیث میں یوں واضح کرتے ہیں:

عَنْ مُعَاذِ بْنِ اَنَسٍ الْجُهَنِی عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اَنَّ رَجُلًا سَاَلَهٗ اَیُّ الْمُجَاهِدِیْنَ اَعْظَمُ اَجْرًا یَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ : ((اَكْثَرُهُمْ لِلّٰهِ تَعَالٰی ذِكْرًا)) قَالَ اَیُّ الصَّائِمِیْنَ اَكْثَرُ اَجْرًا؟ قَالَ:((اَكْثَرُهُمْ لِلّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ ذِكْرًا)) ثُمَّ ذَكَرَ الصَّلَاةَ وَالزَّكَاةَ وَالْحَجَّ وَالصَّدَقَةَ، كُلُّ ذٰلِكَ یَقُوْلُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((اَكْثَرُهُمْ لِلّٰهِ ذِكْرًا)) (مسند احمد)

حضرت معاذ بن انس جہنی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: یارسول اللہ! جہاد کرنے والوں میں سب سے بڑھ کر اجر پانے والا کون ہے؟ فرمایا: ''جو ان میں اللہ کو سب سے زیادہ یاد کرنے والا ہے''۔ اس نے عرض کیا کہ روزہ رکھنے والوں میں سب سے زیادہ اجر کون پائے گا؟ فرمایا: ''جو ان میں سب سے زیادہ اللہ کو یاد کرنے والا ہو۔'' پھر اس شخص نے اسی طرح نماز، زکوٰۃ، حج اور صدقہ کرنے والوں کے متعلق پوچھا اور حضور ﷺ نے ہر ایک کا یہی جواب دیا کہ ''جو اللہ کو سب سے زیادہ یاد کرنے والا ہو!''

لفظ تَطْمَئِنُّ کی وضاحت

سورۃ الرعد کی مذکورہ بالا آیت میں دوسرا خاص لفظ تَطْمَئِنُّ ہے۔ اس کا معنی ہے: وہ مطمئن ہوتی ہے، (دل) اطمینان حاصل کرتے ہیں، وہ سکون پاتے ہیں۔ اِطمِینانٌ سے مضارع واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے جس کا مادہ طمأن ہے (تعلیم القرآن، لغت مرتبہ صابر قرنیؒ)۔ علامہ راغب اصفہانی اس لفظ کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

''الطمانية والاطمينان کے معنی ہیں خلجان کے بعد نفس کا سکون پذیر ہونا۔ قرآن میں ہے: ﴿وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ۭ﴾ (آل عمران:۱۲۶) یعنی اس لیے کہ تمہارے

دلوں کو اس سے تسلی ہو۔ ﴿وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ ؕ﴾ (البقرۃ: ۲۶۰) ''لیکن (میں دیکھنا) اس لیے چاہتا ہوں کہ میرا دل اطمینان حاصل کر لے''۔ اور آیت کریمہ ﴿يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝۲۷﴾ (الفجر) میں نفس مطمئنہ سے مراد وہ نفس ہے جسے برائی کی طرف کسی طور بھی رغبت نہ ہو' اور آیت کریمہ: ﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۝۲۸﴾ (الرعد) ''اور سن رکھو کہ اللہ کی یاد سے ہی دل آرام پاتے ہیں'' میں اس امر پر تنبیہ کی گئی ہے کہ معرفتِ الٰہی اور کثرتِ عبادت سے ہی قلبی سکون حاصل ہوتا ہے' جس قسم کی تسکین کا آیت ﴿وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ ؕ﴾ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوال کیا تھا۔ ارشاد ہے: ﴿وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ﴾ (النحل: ۱۰۶) ''اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو''۔ ﴿فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ﴾ (النساء: ۱۰۳) ''پھر جب خوف جاتا رہے''۔ ﴿وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا﴾ (یونس: ۷) ''دنیا کی زندگی سے خوش اور اس پر مطمئن ہو بیٹھے''۔ اطمأن و تطأمن مادہ اور معنی کے اعتبار سے ایک ہی ہیں۔'' (مفردات القرآن' ترجمہ مولانا محمد عبداللہ فیروز پوری)

روح ''امر اللہ'' اور اس کی غذا ''ذکر اللہ'' ہے

سورۃ الرعد کی مذکورہ بالا آیت کے ضمن میں ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

''دل اور روح کی تسکین کا سب سے بڑا ذریعہ اللہ کا ذکر ہے' اس لیے کہ انسان کی روح اس کے دل کی مکین ہے اور روح کا تعلق براہِ راست اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ہے۔ جیسا کہ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۸۵ میں فرمایا گیا: ﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ﴾ ''اور (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم!) یہ لوگ آپ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں' آپ فرمائیں کہ روح میرے پروردگار کے امر میں سے ہے''۔ لہٰذا جس طرح انسانی جسم کی حیات کا منبع (source) یہ زمین ہے اور جسم کی نشوونما اور تقویت کا سارا سامان زمین ہی سے مہیا ہوتا ہے اسی طرح انسانی روح کا منبع ذاتِ باری تعالیٰ ہے اور اس کی نشوونما اور تقویت کے لیے غذا کا سامان بھی وہیں سے آتا ہے۔ چنانچہ روح امر اللہ ہے اور اس کی غذا ذکر اللہ اور کلام اللہ ہے..... دُنیوی مال ومتاع اور سامانِ عیش وآسائش کی بہتات سے نفس اور جسم کی تسکین کا سامان تو ہو سکتا ہے' یہ چیزیں دل کے سکون واطمینان کا باعث نہیں بن سکتیں۔ دل کو یہ دولت نصیب ہوگی تو اللہ کے ذکر سے ہوگی۔'' (بیان القرآن' حصہ چہارم' سورۃ الرعد' آیت ۲۸)

ذکر اور اطمینانِ قلب

صاحبِ تدبر قرآن لکھتے ہیں:

''کان کھول کر سن لو کہ اگر دلوں کو طمانیت اور ایمان وشرحِ صدر کی نعمت مطلوب ہے تو وہ معجزوں اور کرشموں سے نہیں حاصل ہوتی بلکہ اللہ اور اُس کی صفاتِ جمال وکمال کے تذکر وتفکر سے حاصل ہوتی ہے' تو اگر یہ چیز مطلوب ہے تو پیغمبر کی دعوت سنو اور اس پر غور کرو' ورنہ جس وادی میں چاہو ٹھوکریں کھاتے پھرو۔'' (تدبر قرآن' جلد چہارم' الرعد)

مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ تحریر کرتے ہیں:

''اللہ کی طرف رجوع کرنے والوں کو دولت ایمان نصیب ہوتی ہے اور ذکر اللہ (خدا کی یاد) سے چین اور اطمینان حاصل کرتے ہیں' کیونکہ سب سے بڑا ذکر تو قرآن ہے: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝۹﴾ (الحجر) جسے پڑھ کر ان کے دلوں میں یقین کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ شبہات اور وساوسِ شیطانیہ دور ہو کر سکون واطمینان میسر آتا ہے۔ ایک طرف حق تعالیٰ کی عظمت ومہابت دلوں میں خوف وخشیت پیدا کرتی ہے تو دوسری طرف لامحدود رحمت ومغفرت کا ذکر قلبی سکون وراحت بہم پہنچاتا ہے۔ غرض ان کا دل ہر طرف سے ٹوٹ کر ایک خدا کی طرف جم جاتا ہے اور ذکر اللہ کا نور اُن کے قلوب سے ہر طرح کی دنیوی وحشت اور گھبراہٹ دور کر دیتا ہے۔ دولت' حکومت' منصب' جاگیر یا فرمائشی نشانات کا دیکھ لینا' کوئی چیز انسان کو حقیقی سکون واطمینان سے ہم آغوش نہیں کر سکتی' صرف یادِ الٰہی سے جو تعلق مع اللہ حاصل ہوتا ہے وہی ہے جو دلوں کے اضطراب ووحشت کو دور کر سکتا ہے۔'' (تفسیر عثمانی' سورۃ الرعد)

ذکر وفکر کی تلقین

پروفیسر یوسف سلیم چشتی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''یہ تلقین ذکر وفکر جس کی اہمیت محتاجِ بیان نہیں ہے' قرآن حکیم کی اس آیت سے ماخوذ ہے: ﴿اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۝۱۹۰ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝۱۹۱﴾ (آل عمران)

''بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے اختلاف میں

نشانیاں ہیں عقل والوں کے لیے۔ جو یاد کرتے ہیں اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے اور فکر کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں (اور غور وفکر کے بعد پکار اٹھتے ہیں کہ) اے ہمارے رب! تو نے یہ کائنات بے فائدہ پیدا نہیں کی‘ تو پاک ہے‘ تو (قیامت کے دن) ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچائیو۔‘‘ سالک کو یہ تلقین کی جاتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے ذکر کرتے رہو‘ یہ تلقین اس آیت سے ماخوذ ہے: ﴿وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ (الانفال) ’’اور یاد کرو اللہ کی بہت تاکہ تم فلاح پاؤ۔‘‘ مقصدِ حیات فلاحِ دارین ہے اور حصولِ فلاح کی صورت ذکر کثیر ہے..... اللہ تعالیٰ سرکارِ دو عالم ﷺ کو حکم دیتا ہے: ﴿وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا﴾ (الکھف:۲۸) ’’اے رسولؐ مت کہا مان اس شخص کا جسے ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا ہے۔‘‘ جب اللہ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو فرعون کے پاس بھیجا تو بوقت رخصت انہیں تاکید کی: ﴿اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ﴾ (طٰہٰ) ’’جاؤ تو اور تیرا بھائی (فرعون کے پاس) میری نشانیاں لے کر اور (دیکھنا) میری یاد میں سستی مت کرنا۔‘‘ یہی وجہ ہے کہ مرشد رومی نے متعدد مقامات پر ذکر وفکر کی اہمیت اور فضیلت کو واضح کیا ؎

ایں قدر گفتیم باقی فکر کن
فکر گر جامد بود‘ رو ذکر کن!
ذکر آرد فکر را در اہتزاز
ذکر را خورشید ایں افسردہ ساز

اقبال نے بھی ذکر کی فضیلت واضح کی ہے: ؎

فقر قرآں؟ اختلاطِ ذکر و فکر
فکر را کامل نہ دیدم جز بہ ذکر!

(تاریخ تصوف‘ ص ۱۳۱ تا ۱۳۳)‘‘

ذکر کے مختلف پہلو

سورۂ آل عمران کی آیات ۱۹۰‘۱۹۱ سے یہ معلوم ہوا کہ اٹھتے بیٹھتے‘ چلتے پھرتے‘ سوتے جاگتے ہر وقت اللہ کو اور اُس کے احکامات کو یاد رکھنا چاہیے۔ دوسری اہم بات یہ اخذ ہوتی ہے کہ ذکر میں ’’تفکّر‘‘ بھی شامل ہے۔ تفکر میں کسی بات کی ماہیت اور اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا جاتا ہے‘ جبکہ تدبر اس سے بھی آگے کی منزل ہے جس میں کسی بات کی ماہیت کے ساتھ اس میں

پنہاں حکمت کا بھی سراغ لگایا جاتا ہے۔ ذکر سے محروم ہونا غفلت کا عکاس ہے‘ قرآن حکیم نے غافلین میں شامل ہونے سے منع کیا ہے‘ فرمایا: ﴿وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ﴾ (الاعراف) ’’(اے نبی ﷺ!) اپنے رب کو صبح وشام یاد کیا کرو‘ دل ہی دل میں‘ زاری اور خوف کے ساتھ اور زبان سے بھی ہلکی آواز کے ساتھ‘ اور تم ان لوگوں میں نہ ہو جاؤ جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔‘‘

ذکر کے دو پہلو ہیں‘ ایک لزوم کا درجہ رکھتا ہے اور دوسرا نوافل کا۔ نماز‘ تلاوتِ قرآن‘ مشاہدۂ کائنات‘ تفکرِ کائنات‘ تدبرِ قرآن‘ مسنون اذکار وادعیہ استعاذہ کا اہتمام سب ذکر کی مختلف صورتیں ہیں جن کا تسلسل قائم رہنا چاہیے۔ اللہ کو بھلا دینے اور اُسے فراموش کر دینے کا نتیجہ خود فراموشی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ قرآن نے کہا ہے: ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ﴾ (الحشر:۱۹) ’’اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے انہیں خود اپنا آپ بھلا دیا‘‘۔ جو اللہ کو یاد رکھتا ہے وہ بھی اسے یاد رکھتا ہے۔ اس کی یاد علامت ہے اس کے تشکر وامتنان کی اور اس سے اعراض کفر کی علامت ہے۔ ذکر سے اللہ کی معیت نصیب ہوتی ہے اور اس کا تقرب حاصل ہوتا ہے۔

ذکر الٰہی کی اہمیت احادیث مبارکہ کی روشنی میں

حدیث قدسی ہے:

((قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اَنَا مَعَ عَبْدِيْ حَيْثُمَا ذَكَرَنِيْ وَتَحَرَّكَتْ بِيْ شَفَتَاهُ))(۱)

’’اللہ تعالیٰ کہتا ہے جس وقت بندہ میرا ذکر کرتا ہے اور میری یاد سے اس کے ہونٹ حرکت کرتے ہیں تو اس وقت میں اپنے بندے کے ساتھ ہوتا ہوں۔‘‘

دوسری حدیث قدسی میں ہے‘ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

((اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِيْ بِيْ وَاَنَا مَعَهٗ اِذَا ذَكَرَنِيْ، فَاِنْ ذَكَرَنِيْ فِيْ نَفْسِهٖ ذَكَرْتُهٗ فِيْ نَفْسِيْ ، وَاِنْ ذَكَرَنِيْ فِيْ مَلَاءٍ ذَكَرْتُهٗ فِيْ مَلَاءٍ خَيْرٍ مِنْهُمْ)) (۲)

’’میرا معاملہ بندے کے ساتھ اس کے گمان کے مطابق ہے اور میں اُس کے ساتھ ہوتا

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب التوحید‘ باب قول اللّٰہ تعالیٰ **لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ** .....

(۲) صحیح البخاری‘ کتاب التوحید‘ باب قول اللہ تعالیٰ **وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ**۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار‘ باب الحث علی ذکر اللّٰہ تعالیٰ۔

ہوں جب وہ مجھے یاد کرتا ہے۔ اگر وہ مجھے اپنے گمان میں یاد کرے تو میں بھی اُس کو اپنے جی میں یاد کروں گا' اور اگر وہ مجھے دوسرے لوگوں کے سامنے یاد کرے تو میں ان سے بہتر بندوں کی جماعت میں اس کا ذکر کروں گا (یعنی ملائکہ مقربین کی جماعت میں اس کا ذکر کروں گا)۔''

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان پر پنجگانہ نماز فرض کی ہے۔ یہ اُس کی یاد یعنی ذکر کی نہایت اہم اور بہترین صورت ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ بندہ منکرات سے رک جاتا ہے' اس لیے کہ یہ فواحش و منکرات سے روکتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ یہ نماز واقعتاً ذکر والی ہو۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہر چیز کی قلعی ہوتی ہے اور یقیناً دلوں کی قلعی اللہ کی یاد ہے' اس سے قلب کو تسکین وطمانیت حاصل ہوتی ہے۔

ذکر کی چار فضیلتیں

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر کی چار فضیلتیں بیان کی ہیں' فرمایا:

((لَا يَقْعُدُ قَوْمٌ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ اِلَّا حَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ وَنَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِيْنَةُ وَذَكَرَهُمُ اللّٰهُ فِيْمَنْ عِنْدَهٗ)) (۱)

''جب بھی اور جہاں بھی کچھ بندگانِ خدا اللہ کا ذکر کرتے ہیں تو لازمی طور پر (۱) فرشتے ہر طرف سے ان کے گرد جمع ہو کر ان کو گھیر لیتے ہیں' اور (۲) رحمتِ الٰہی ان پر چھا جاتی ہے اور ان کو اپنے سایہ میں لے لیتی ہے' اور (۳) ان پر سکینت کی کیفیت نازل ہوتی ہے' اور (۴) اللہ اپنے ملائکہ مقربین میں ان کا ذکر فرماتا ہے۔''

قرآنی دعاؤں کے اہتمام کے ساتھ ساتھ صحیح و مستند احادیث میں جن اذکار کی طرف توجہ دلائی گئی ہے' اگر ان کا انصرام کیا جائے تو یہ زیادہ اجر و ثواب کا موجب ہے' اس لیے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر انہی کا اہتمام فرماتے تھے۔

حقیقتِ ذکر

حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک مسترشد کے خط کے جواب میں حقیقت ذکر کو یوں بیان کرتے ہیں:

(۱) صحیح مسلم' کتاب الذکر والدعاء والتوبة والاستغفار' باب فضل الاجتماع علی تلاوة القرآن وعلی الذکر۔

''ذکر لسانی ایک ذریعہ ہے مقصود نہیں' مقصود محض یاد ہے۔ اگر یاد نصیب ہو جائے تو ذکر لسانی چھڑا دیا جاتا ہے مگر بقا کے بعد بھی ترقی عبادات ہی سے ہے' یعنی قرآن کا پڑھنا' ذکر الٰہی کرنا اس سے ہی ترقی ہے' خاموش بیٹھنے اور محض تدبر سے نہیں۔ فرمایا تصوف ایک مشق ہے' ایک طریقہ ہے جو الہامِ الٰہی سے اولیاء اللہ پر اپنے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق منکشف ہوتا ہے۔ اس طریق پر چلنے سے انسان کو یقین نصیب ہو جاتا ہے اور خداوند تعالیٰ کی دائمی یاد نصیب ہو جاتی ہے۔ راستہ میں بہت سے سٹیشن آتے ہیں اور بہت سی کیفیات بھی' لیکن اصل مقصد یہی یاد ہے' یہی تعلق مع اللہ ہے جس کو آپ نسبت کہہ دیں یا کچھ اور نام دے دیں۔ درحقیقت یہی یاد ہے جو کہ مقصود ہے اور تمام تصوف کا خلاصہ ہے۔ اولیاء اللہ کرامات کو اتنا وقیع اور اہم نہیں سمجھتے جتنا کہ تعلق مع اللہ اور اہتمامِ شریعت کو' اصل چیز تعلق مع اللہ کا اہتمام ہے اس کے ساتھ اتباعِ شریعت خود آ جاتی ہے..... تعلق مع اللہ کے بعد یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ انسان اللہ کی نافرمانی کرے۔''

ایک دوسرے مرید کے جواب میں ذکر کے اثرات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''نہ معلوم لوگ کیا سمجھتے ہیں' اثراتِ ذکر تو یہ ہیں کہ دنیا سے بے رغبتی ہو' آخرت کا خیال ہو اور دنیا اتنی جاذب نظر نہ رہے''۔ (سوانح مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ از سید ابوالحسن علی ندویؒ)

ذکر اور چند اصولی باتیں

الفوز اکیڈمی اسلام آباد کے زیر اہتمام شائع کی جانے والی کتاب ''تزکیۂ نفس'' کے مرتبین نے 'ذکر' کے بارے میں چند اصولی باتیں بیان کی ہیں' ان کے افادی پہلو کے پیش نظر ذیل میں بیان کی جا رہی ہیں:

(۱) ذکر کے الفاظ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہوں' یہ محبتِ رسول و اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تقاضا ہے۔

(۲) ذکر کی مقدار محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم شارع ہیں' اس لیے کسی اور شخص کو کسی خاص ذکر کی مقدار (۱۰۰۰' ۱۰۰' ۲۱' ۱۱' ۹' ۳) کے تعین کا اختیار نہیں دیا جا سکتا۔

(۳) ذکر کے ساتھ غیر مسنون حرکاتِ بدن سے اجتناب ضروری ہے۔ ذکر ایک عبادت ہے۔ عبادات میں (عادات کے برعکس) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے انحراف عبادت کو بدعت میں تبدیل کر دیتا ہے' مثلاً ذکر کے ساتھ جھومنا' رقص کرنا' وجد میں آنا' سر' ہاتھ یا

گردن کو مخصوص طریقے سے جنبش دینا یا جھٹکے دینا۔

(۴) کوئی پیر، کسی مخصوص مرید کے حالات کی رعایت کرتے ہوئے اسے کوئی خاص ذکر تجویز کرنا چاہتے ہوں تو انہیں بھی حضور ﷺ سے ثابت شدہ صحیح احادیث پر مشتمل ذخیرۂ اَذکار ہی سے ذکر کا انتخاب کرنا چاہیے (جامع ترمذی، مشکوٰۃ المصابیح وغیرہ میں دعاؤں اور اذکار سے متعلق جو اَبواب ہیں ان سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔)

(۵) 'ذکر' سستی اور کاہلی کا نام نہیں ہے۔ ذکر انسان کو کاروبارِ حیات میں زیادہ فعال اور متحرک کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ذکر میدانِ بدر، اُحد، اَحزاب، حنین اور تبوک کے معرکوں میں نہ صرف ان کے تعلق باللہ میں اضافہ کا سبب بنا بلکہ وہ اور زیادہ سرگرمِ عمل ہوگئے۔

(۶) ذکر کے اہتمام سے کاروبارِ حیات ماند نہیں پڑتا بلکہ زیادہ صاف وشفاف ہوجاتا ہے۔

(۷) ذکر کا اہتمام اجتماعی ذمہ داریوں سے فرار کا عذر اور بہانہ نہیں بننا چاہیے۔ ذاکر زکوٰۃ و صدقات کی وصولی اور تقسیم کا کام کرے اور معاشرے کے سلگتے ہوئے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرے۔

اخذ واستفادہ

(۱) تدبر قرآن، جلد چہارم، از مولانا اصلاحیؒ

(۲) تفہیم القرآن، جلد چہارم، پنجم از سید مودودیؒ

(۳) بیان القرآن، جلد چہارم، از ڈاکٹر اسرار احمدؒ

(۴) تفسیرِ عثمانی، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ

(۵) تاریخِ تصوف، پروفیسر یوسف سلیم چشتیؒ

(۶) تزکیۂ نفس، الفوز اکیڈمی اسلام آباد

(۷) سوانح عبدالقادر رائے پوریؒ، ابوالحسن علی ندویؒ

(۸) مفردات القرآن، علامہ راغب اصفہانیؒ

(۹) تعلیم القرآن، لغت از صابر قرنیؒ

❁❁❁

حیاتِ طیّبہ کا سخت ترین دن:

یومِ طائف

حافظ محمد زاہد☆

نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آغازِ نبوت سے پہلے عرب میں آپؐ کو بہت عزت وتوقیر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا' یہی وجہ ہے کہ آپؐ پورے عرب میں ''صادق وامین'' کے لقب سے مشہور تھے۔لیکن جب نبی اکرم ﷺ نے اپنی نبوت کا اعلان فرمایا اور تبلیغِ اسلام کا آغاز کیا تو کفار کی جانب سے آپؐ کو مختلف قسم کی زبانی اور جسمانی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا ـــــ راہِ اسلام میں پیش آنے والی ان ایذا رسانیوں کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کے دین کو ظاہر کرنے اور اس کی طرف لوگوں کو بلانے کی راہ میں جس قدر مجھ کو خوف ودہشت میں مبتلا کیا گیا اس قدر کسی اور کو خوف ودہشت میں مبتلا نہیں کیا گیا اور اللہ کے دین کی راہ میں جتنی ایذا رسانیوں سے میں دوچار ہوا ہوں اتنی ایذا رسانیوں سے کوئی اور دوچار نہیں ہوا ہے۔'' (سنن الترمذی) جبکہ ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''(اللہ کے دین کی تبلیغ میں) جتنا مجھے ستایا گیا اتنا کسی اور نبی کو نہیں ستایا گیا۔''

ذیل میں عمومی طور پر انہی زبانی اور جسمانی تکالیف کا ترتیب وار' جبکہ خصوصی طور پر یومِ طائف کی سختیوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

کفار کی جانب سے نبی اکرم ﷺ کا استہزا اور تمسخر

نبی اکرم ﷺ نے نبوت ملنے کے بعد جب اپنے خاندان والوں کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے جمع کیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ سب نے مخالفت کی اور ابولہب نے تو معاذ اللہ یہاں تک کہہ دیا: تَبًّا لَكَ ' اَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا؟ ''اے محمد! تمہارے ہاتھ ٹوٹ جائیں' کیا تم نے ہمیں اس کام کے لیے جمع کیا تھا؟'' اس کے بعد جب آپ ﷺ نے عام لوگوں میں اسلام کی

☆ادارتی معاون' شعبہ مطبوعات' قرآن اکیڈمی' لاہور۔

تبلیغ کا آغاز کیا تو قریش مکہ نے سب سے پہلے تو زبانی طور پر آپؐ کا استہزا اور تمسخر اُڑایا اور آپؐ کو (نفلِ کفر' کفر نہ باشد!) مجنون' شاعر' کاہن اور پاگل قرار دیا۔کسی نے کہا: لگتا ہے ان کے دماغ کو کوئی عارضہ لاحق ہوگیا ہے۔کسی نے کہا: ان پر آسیب کا اثر ہے اسی لیے یہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگ گئے ہیں۔کسی نے کہا: یہ غاروں میں جاتے ہیں' اس لیے ان پر جن کا سایہ ہوگیا ہے۔کسی نے کہا: کچھ عرصہ پہلے تک تو اچھے بھلے آدمی تھے' پتا نہیں اب انہیں کیا ہوگیا ہے۔

کفار کی جانب سے ان باتوں پر نبی اکرم ﷺ کا دل گھٹتا تھا' جس کے بارے میں سورۃ الحجر میں فرمایا گیا: ﴿ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴿٩٧﴾ ''اور البتہ تحقیق ہم جانتے ہیں کہ آپؐ کا سینہ اُن باتوں سے گھٹتا ہے جو یہ (کفار) کہتے ہیں'' ـــــ اللہ تعالیٰ نے کفار کی ان جلی کٹی باتوں کے رد اور اپنے محبوب ﷺ کی تسلی ودلجوئی کے لیے مختلف آیات نازل فرمائیں۔مثلاً سورۃ القلم میں فرمایا:

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ﴿١﴾ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ﴿٢﴾ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ﴿٣﴾ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ﴿٤﴾

''ن۔قسم ہے قلم کی اور اُس چیز کی جسے لکھنے والے لکھ رہے ہیں۔(اے نبی ﷺ!) آپ اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہیں۔اور یقیناً آپ کے لیے نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔اور بے شک آپ اعلیٰ اخلاق کے مرتبے پر فائز ہیں۔''

سورۃ الحاقہ میں فرمایا:

وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ﴿٤١﴾ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿٤٢﴾

''یہ کسی شاعر کا قول نہیں' (افسوس) تمہیں بہت کم یقین ہے۔اور یہ کسی کاہن کا قول نہیں ہے' لیکن (افسوس) کہ تم بہت کم نصیحت پکڑتے ہو۔''

نبی اکرم ﷺ کے جاں نثار ساتھیوں پر بدترین تشدد

کفار کی طرف سے استہزا اور تمسخر کے باوجود نبی اکرم ﷺ جب اپنے موقف پر ڈٹے رہے اور توحید کا برملا اعلان کرتے رہے تو کفار نے دوسرا حربہ استعمال کیا اور وہ تھا جسمانی تشدد کا راستہ۔حضور نبی اکرم ﷺ تو جناب ابوطالب کے تحفظ میں تھے' اس لیے کفار آپؐ کو تو کچھ نہ کہہ سکتے تھے' لیکن کفار نے آپؐ کے جاں نثار ساتھیوں کو بدترین تشدد کا نشانہ بنایا اور اس بدترین تشدد کا نشانہ بنے: حضرت بلال' حضرت خباب بن ارت' حضرت یاسر' حضرت سمیہ رضی اللہ عنہم

وغیرہم۔ان مقدس ہستیوں پر کفار کی جانب سے کیے جانے والے تشدد کے واقعات پڑھتے ہوئے حقیقی معنوں میں روح تک کانپ اُٹھتی ہے اور دل سے ایک آہ دعا کی شکل میں نکلتی ہے: یا اللہ! ان اصحاب کے درجات کو بلند سے بلند تر فرما جنہوں نے تیرے دین کی خاطر انتہائی اذیتیں برداشت کیں اور تیرے دین کی سربلندی کے لیے اپنی جانیں تک قربان کر دیں۔

کفار کی جانب سے نبی اکرم ﷺ کو مصالحانہ پیشکش

کفار کے اس حربے کے باوجود بھی نبی اکرم ﷺ تبلیغ اسلام پر ڈٹے رہے تو پھر کفار نے ایک تیسرا حربہ استعمال کیا اور وہ حربہ تھا مصالحانہ پیشکشوں اور لالچ کا۔ چنانچہ ابن ربیعہ قریش کی طرف سے نمائندہ بن کر حضور ﷺ کی خدمت میں آیا اور کہا: اے محمد (ﷺ)! اگر تم بادشاہت کے خواب دیکھ رہے ہو تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ بنا لیتے ہیں۔ اگر تمہیں دولت چاہیے تو ہم تمہارے قدموں میں دولت کے انبار لگا دیتے ہیں۔ اگر کہیں شادی کرنے کی تمہاری کوئی خواہش ہے تو جس گھرانے میں کہو ہم تمہاری شادی کرا دیتے ہیں۔ لیکن تم بس اس نئے دین سے اور ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہنے سے باز آ جاؤ۔ قریش مکہ کی طرف سے اس پیشکش پر محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے جو جواب دیا وہ آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

''اگر تم لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور ایک ہاتھ میں چاند رکھ دو تب بھی میں اُس کام سے باز نہیں آ سکتا جس پر میں اپنے ربّ کی جانب سے مامور ہوا ہوں۔''

کفار کا جناب ابوطالب کو الٹی میٹم

کفار کا یہ حربہ بھی جب ناکام و نامراد ہوا تو اب ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور قریش مکہ کا ایک وفد جناب ابوطالب کے پاس آیا اور کہا: اے ابوطالب! ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ اب تمہارے پاس دو ہی راستے ہیں: یا تو محمد (ﷺ) کے تحفظ سے دستبردار ہو جاؤ یا پھر میدان میں آ کر ہمارا مقابلہ کرو۔ یہ وہ موقع تھا جب جناب ابوطالب کی ہمت بھی جواب دے گئی۔ اس موقع پر انہوں نے حضور ﷺ کو بلایا اور کہا: بھتیجے! مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈال کہ جسے میں برداشت نہ کر سکوں۔ یہ سنتے ہی حضور ﷺ کی آنکھوں میں نمی آ گئی' لیکن آپؐ کے قدم اپنے مقصد سے ڈگمگائے نہیں اور آپ ﷺ نے جناب ابوطالب سے فرمایا:

''چچا جان! اب یا تو یہ کام پورا ہو کر رہے گا جو میرے ربّ کی جانب سے میرے حوالے کیا گیا ہے' یا میں اسی میں اپنے آپ کو ہلاک کر دوں گا۔''

شعب اَبی طالب کے تین سال

کفار کی طرف سے الٹی میٹم ملنے کے باوجود نبی اکرم ﷺ کی استقامت دیکھ کر جناب ابوطالب نے حضرت محمد ﷺ کے تحفظ کا یہ سلسلہ جاری رکھا۔ اس پر قریش کے تمام قبائل نے متفقہ طور پر ایک معاہدہ تحریر کیا کہ محمد (ﷺ)' بنی ہاشم اور اس کے تمام حامیوں سے یک لخت تمام تعلقات قطع کر دیے جائیں۔ نہ کوئی شخص بنی ہاشم سے نکاح کرے اور نہ ان سے میل جول رکھے جب تک کہ بنو ہاشم محمد (ﷺ) کو قتل کے لیے ہمارے حوالے نہ کر دیں۔ یہ معاہدہ لکھ کر اندرونِ کعبہ میں لٹکا دیا گیا۔ ابوطالب نے مجبور ہو کر نبوی میں پورے خاندان بنی ہاشم اور بنو مطلب کے ساتھ ایک گھاٹی ''شعب ابی طالب'' میں محصور ہو کر پناہ لے لی۔

یہ شدید ترین مقاطعہ تھا اور کھانے پینے کی کوئی چیز گھاٹی میں داخل نہیں ہونے دی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دوران ایسا وقت بھی آیا کہ بنی ہاشم کے بھوک سے بلکتے ہوئے بچوں کے حلق میں ڈالنے کے لیے اس کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا کہ چمڑے کے سوکھے جوتوں کو ابال کر اُن کا پانی ٹپکا دیا جائے۔ یہ معاشرتی بائیکاٹ تقریباً تین سال کے عرصے تک جاری رہا اور اس دوران بنی ہاشم کے پورے خاندان نے نبی اکرم ﷺ کے تحفظ کی پاداش میں انتہائی مشکل وقت گزارا۔ (اس مقاطعہ کے دوران کیا حالات رہے' اس کی تفصیل ''سیرۃ المصطفیٰ ﷺ'' میں درج ہے۔)

بالآخر ۱۰ نبوی میں نبی اکرم ﷺ نے ابوطالب کو یہ خبر دی کہ وہ معاہدہ سارے کا سارا (سوائے اسماء الٰہی کے) کیڑوں نے کھا لیا ہے۔ جب کفار نے دیکھا تو حقیقت میں ایسا ہی تھا۔ اسے دیکھتے ہی سب کفار کی گردنیں شرم و ندامت سے جھک گئیں اور اس طرح یہ مقاطعہ ختم ہوا۔

کفار کی جانب سے نبی اکرم ﷺ کو جسمانی اذیتیں

۱۰ نبوی میں اس مقاطعہ سے تو نجات مل گئی' لیکن اسی سال حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا اور جناب ابوطالب کا انتقال ہو گیا۔ جناب ابوطالب کے فوت ہوتے ہی قبیلہ بنی ہاشم کا سردار ابولہب بن گیا جو شروع دن سے ہی محمد ﷺ کا جانی دشمن تھا۔ اس طرح نبی اکرم ﷺ کو جو بنی ہاشم کا تحفظ حاصل تھا وہ ختم ہو گیا اور کفار نے آپؐ کو سخت جسمانی ایذیتیں دینی شروع کر دیں' جن کی تفصیل تحریر کرتے قلم لڑکھڑا جاتے ہیں۔

آپ ﷺ پر دست درازی بھی ہوئی' آپؐ کے شانۂ مبارک پر راکھ بھی ڈالی گئی' آپؐ

کے راستے میں کانٹے بھی بچھائے گئے‘ آپؐ کی گردن میں ایک چادر کو پھندے کی صورت میں ڈال کر اُس کے دونوں سروں کو بل دے کر اس طرح کھینچا گیا کہ آپؐ کی آنکھیں اُبل آئیں۔ ایسا بھی ہوا کہ آپؐ اپنے خالق کے سامنے اور عین کعبے کی دیوار کے سائے میں سربسجود تھے کہ عقبہ بن ابی معیط نے ابوجہل کی شہ پر ایک اونٹ کی نجاست بھری اوجھڑی لا کر حضور ﷺ کے شانۂ مبارک پر رکھ دی۔

سفرِ طائف اور اس کی وجوہات

مندرجہ بالا حالات میں نبی اکرم ﷺ نے مکہ کے علاوہ کسی اور علاقہ کو اپنا مسکن اور دین اسلام کا مرکز بنانے کا سوچا اور اس کے لیے آپؐ کی نظر انتخاب طائف پر پڑی۔ چنانچہ آپؐ نے شوال ۱۰ نبوی میں حضرت زید بن حارثہ ؓ کے ہمراہ طائف کے لیے رختِ سفر باندھا۔ سفر طائف کے ضمن یہ سوال بہت اہمیت کا حامل ہے کہ دس سال کے طویل عرصہ میں نبی اکرم ﷺ مکہ سے باہر کسی اور علاقہ میں نہیں گئے‘ پھر دسویں سال ایسا کیا ہوا کہ آپؐ کو طائف کا سفر کرنا پڑا۔ تاریخ کی کتابوں میں اس کی دو وجوہ ملتی ہیں:

(۱) دس نبوی تک نبی اکرم ﷺ کو جناب ابوطالب کا تحفظ حاصل تھا اور قبائلی نظام میں یہ روایت تھی کہ جب کسی شخص کو قبیلہ کے سردار کا تحفظ حاصل ہو اور کسی دوسرے قبیلہ والے اُس شخص کے خلاف کوئی اقدام کریں تو یہ سارے قبیلے کے خلاف اقدام شمار ہوتا تھا۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ ان دس سالوں میں کفارِ مکہ نے نبی اکرم ﷺ کے ساتھیوں کو تو جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا مگر کسی میں یہ جرأت نہیں تھی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو کوئی جسمانی اذیت دیتا۔ لیکن دس نبوی میں جناب ابوطالب کی وفات کے بعد نبی اکرم ﷺ کو بنی ہاشم کا تحفظ ختم ہو گیا اور قریش مکہ نبی اکرم ﷺ کو طرح طرح کی جسمانی اذیتیں دینے لگے‘ حتیٰ کہ آپؐ کو قتل کرنے کے بھی مشورے ہونے لگے۔ ان حالات میں نبی اکرم ﷺ نے مکہ کے علاوہ کسی اور علاقہ کو دین اسلام کا مرکز بنانے کا سوچا اور اس کے لیے آپ نے طائف کا سفر کیا۔

(۲) سیرت کی بعض کتابوں مثلاً ’’محسن انسانیت‘‘ میں سفر طائف کی ایک اور وجہ بھی مذکور ہے‘ وہ یہ کہ ایک روز رسول اکرم ﷺ علی الصباح گھر سے نکلے اور خدا کا پیغام سنانے کے لیے مکہ کے مختلف کوچوں میں گھومے پھرے‘ لیکن وہ ایک دن پورا ایسا گزرا کہ آپؐ

کو ایک آدمی بھی ایسا نہ ملا جو آپؐ کی بات کو سنتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کفارِ مکہ نے اب یہ نیا منصوبہ بنایا اور لوگوں کو کہا کہ جب آپؐ کو اپنی طرف آتا دیکھیں تو اِدھر اُدھر ہو جائیں‘ کیونکہ بات سننے سے بات پھیلتی ہے اور مخالفت کرنے اور بحثیں چھیڑنے سے وہ اور زیادہ اُبھرتی ہے۔ یہ سکیم کامیاب رہی اور اس طرح اُس دن جو بھی لوگ ملے انہوں نے استہزا اور غنڈہ گردی کا مظاہرہ کیا اور آپؐ کو سننا گوارا نہ کیا۔

اُس روز آپ ﷺ پورا دن گزار کر جب واپس پلٹے تو اداسی کا ایک بھاری بوجھ آپؐ کے سینے پر لدا ہوا تھا۔ سخت گھٹن تھی‘ ایسی گھٹن جو کسی کی خیرخواہی کرنے والے کو اس وقت ہوتی ہے کہ جس کی وہ خیرخواہی کر رہا ہو‘ وہی خود محسن کشی پر اُتر آئے۔ یہ وہ دور تھا جب آپؐ کی غم گسار اور آپؐ کو ہر وقت دلاسہ دینے والی رفیقہ حیات کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ تو اس دن آپؐ کے دل میں یہ رجحان پیدا ہو گیا تھا کہ اب مکہ سے باہر نکل کر کام کرنا چاہیے‘ کیونکہ اب مکہ کی زمین دین اسلام کے لیے بنجر ہو گئی ہے۔

طائف کے سرداروں کو دعوتِ اسلام اور ان کا جواب

نبی اکرم ﷺ کو جب مکہ کی سرزمین تنگ ہوتی نظر آئی تو آپ ﷺ نے طائف کا سفر اس اُمید پر اختیار کیا کہ شاید وہاں کوئی سردار ایمان لے آئے تو میں اپنا مرکز وہاں منتقل کر دوں گا۔ گئے تو آپؐ اس ارادے سے تھے‘ مگر وہاں حضور ﷺ پر جو بیتی‘ وہ مکہ میں دس سال میں نہیں بیتی تھی۔ طائف پہنچنے کے بعد آپ ﷺ نے وہاں کے تین سرداروں سے ملاقات کی جو آپس میں بھائی تھے‘ اور انہیں اسلام کی دعوت دی۔ انہوں نے اس دعوت کے جواب میں جو کہا وہ بیان کرتے ہوئے دل شق ہو جاتا ہے اور سننے کے لیے بھی بڑے جگر کی ضرورت ہے۔ تینوں نے بہت ہی تمسخر آمیز اور تحقیر آمیز انداز اختیار کیا۔

ایک نے کہا: ’’اگر اللہ نے تمہیں رسول بنا کر بھیجا ہے تو وہ گویا خود کعبے کے پردے کو چاک کر رہا ہے۔‘‘ دوسرے نے کہا: ’’میں تم سے بات بھی کرنے کے لیے تیار نہیں‘ اس لیے کہ اگر تم سچے ہو اور واقعتاً رسول ہو تو میں کہیں توہین کا مرتکب ہو کر عذابِ خداوندی کا نوالہ نہ بن جاؤں اور اگر تم جھوٹے ہو تو جھوٹے اس قابل نہیں ہوتے کہ انہیں منہ لگایا جائے‘‘۔ تیسرے نے انتہائی تحقیر آمیز انداز میں کہا: ’’کیا اللہ کو تمہارے سوا کوئی اور شخص نبوت و رسالت کے لیے نہیں ملا؟‘‘

یومِ طائف کی سختیاں

طائف کے سرداروں نے ایک طرف تو نبی اکرم ﷺ کی دعوت کا جواب انتہائی تحقیر آمیز انداز میں دیا اور پھر یہ سوچ کر کہ کہیں یہ ہماری رعایا کو اسلام کی دعوت نہ دیں' انہوں نے چند اوباش نوجوان لڑکوں اور اپنے غلاموں کو نبی اکرم ﷺ کے پیچھے لگا دیا جو آپؐ کے پیچھے پیچھے تالیاں بجا رہے تھے اور (نعوذ باللہ) آپؐ کا تمسخر اُڑا رہے تھے۔ پھر ان اوباشوں نے زبانی تمسخر کے ساتھ ساتھ (معاذ اللہ) نبی اکرم ﷺ کو پتھر مارنے شروع کر دیے۔ حضرت زید بن حارثہ آپ ﷺ کے بچاؤ کے لیے آپ کے سامنے آتے تو وہ پیچھے پتھر مارنا شروع کر دیتے اور جب وہ پیچھے آتے تو وہ سامنے سے پتھر مارنا شروع کر دیتے۔ اُن اوباشوں نے تاک تاک کر آپ ﷺ کے ٹخنے کی ہڈیوں کو نشانہ بنایا۔ حضور اکرم ﷺ کا جسم مبارک لہولہان ہو گیا اور نعلین خون سے بھر گئیں۔ ایک موقع پر حضور ﷺ ضعف کی وجہ سے ذرا بیٹھ گئے تو دو غنڈے آگے بڑھے' ایک نے ایک بغل میں ہاتھ ڈالا اور دوسرے نے دوسری میں اور اٹھا کر کھڑا کر دیا کہ یہاں نہ بیٹھو' بلکہ آگے چلو۔ اس طرح غنڈوں کے غول میں گرتے پڑتے آپ ﷺ طائف کی حدود سے باہر نکلے۔

اگر دیکھا جائے تو یہ نبی اکرم ﷺ پر ذاتی اعتبار سے ابتلا اور امتحان کا نقطہ عروج ہے اور اس دن کو نبی اکرم ﷺ نے ایک موقع پر اپنی حیاتِ طیبہ کا سخت ترین دن قرار دیا۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: کیا یومِ اُحد سے بھی سخت دن آپؐ پر آیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

((لَقَدْ لَقِيتُ مِنْ قَوْمِكِ مَا لَقِيتُ وَكَانَ اَشَدَّ مَا لَقِيتُ مِنْهُمْ يَوْمَ الْعَقَبَةِ اِذْ عَرَضْتُ نَفْسِيْ عَلَى ابْنِ عَبْدِ يَالِيْلَ بْنِ عَبْدِ كُلَالٍ فَلَمْ يُجِبْنِيْ اِلٰى مَا اَرَدْتُ.....)) (صحيح البخاری)

''میں نے تمہاری قوم کے ہاتھوں جو جو تکلیفیں اُٹھائی ہیں وہ تو اُٹھائی ہیں اور سب سے زیادہ تکلیف جو میں نے اٹھائی وہ عقبہ کے دن تھی جب میں نے اپنے آپ کو ابن عبد یا لیل بن عبد کلال کے سامنے پیش کیا تو اُس نے میری خواہش کو پورا نہیں کیا.....''

نبی اکرم ﷺ کی دعا (دعائے مُستَضعَفین)

نبی اکرم ﷺ زخموں سے چور طائف کی حدود سے باہر ایک باغ کے احاطے میں آ گئے۔ یہ باغ قریش مکہ کے سردار ربیعہ کے بیٹوں عتبہ اور شیبہ کا تھا۔ آپؐ بالکل بے دم ہو کر انگور کی ایک بیل سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ اس موقع پر آپ ﷺ کے زبانِ مبارک سے ایک درد بھری دعا نکلی۔ اس طرح کی دعا نہ کبھی آپ ﷺ کی زبان مبارک پر اُس دن سے پہلے آئی اور نہ کبھی اُس دن کے بعد۔ یہ دعا ''دعائے مستضعفین'' کے نام سے مشہور ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

اَللّٰهُمَّ اِلَيْكَ اَشْكُوْا ضُعْفَ قُوَّتِيْ وَقِلَّةَ حِيْلَتِيْ وَهَوَانِيْ عَلَى النَّاسِ

''اے اللہ! کہاں جاؤں کہاں' فریاد کروں۔ تیری ہی جناب میں فریاد لے کر آیا ہوں! اپنی قوت کی کمزوری کا' اپنے ذرائع و وسائل کی کمی کا اور لوگوں میں جو یہ رسوائی ہو رہی ہے اس کا!''

اِلٰى مَنْ تَكِلُنِيْ؟ اِلٰى بَعِيْدٍ يَتَجَهَّمُنِيْ اَوْ اِلٰى عَدُوٍّ مَّلَّكْتَ اَمْرِيْ؟

''اے اللہ! تو مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے؟ کیا تو نے میرا معاملہ دشمنوں کے حوالے کر دیا ہے کہ وہ جو چاہیں میرے ساتھ کر گزریں!''

اِنْ لَّمْ يَكُنْ عَلَيَّ غَضَبُكَ فَلَا اُبَالِيْ

''پروردگارا اگر تیری رضا یہی ہے' اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے تو پھر مجھے کوئی پروا نہیں۔''

اَعُوْذُ بِنُوْرِ وَجْهِكَ الَّذِيْ اَشْرَقَتْ لَهُ الظُّلُمٰتُ

''پروردگار! میں تیرے ہی روئے انور کی ضیا کی پناہ میں آتا ہوں' جس سے تاریکیاں دور ہو جاتی ہیں۔''

حضرت عداس رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں

باغ کے مالک عتبہ اور شیبہ بھی سارا ماجرا دیکھ رہے تھے کہ کس طرح لوگ نبی اکرم ﷺ پر پتھراؤ کر رہے ہیں۔ جب وہ باغ میں آئے اور نبی اکرم ﷺ کو انگور کی بیل کے ساتھ بے یار و مددگار ٹیک لگائے دیکھا تو ان کے دلوں میں ہمدردی کے جذبات اُمڈ آئے۔ انہوں نے اپنے نصرانی غلام ''عداس'' کو پکارا اور ایک طشتری میں انگوروں کا خوشہ رکھوا کر آپؐ کے لیے بھجوایا۔ عداس انگور پیش کر کے آنحضور ﷺ کے سامنے بیٹھ گیا۔ آپؐ نے ہاتھ انگور کی طرف بڑھاتے ہوئے بسم اللہ کہا تو عداس کہنے لگا: خدا کی قسم! اس طرح کی بات اس شہر کے لوگ تو

کبھی نہیں کہتے۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: ''تم کس شہر کے آدمی ہو اور تمہارا دین کیا ہے؟'' اس نے بتایا کہ میں نصرانی ہوں اور میں نینوا شہر کا رہنے والا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: ''تم یونس بن متیٰ جیسے مردِ صالح کی بستی کے آدمی ہو؟'' عداس نے حیرت سے پوچھا: آپؐ کو کیسے معلوم ہے کہ یونس بن متی کون تھے؟ آپ ﷺ نے کہا: ''وہ میرا بھائی ہے' وہ بھی نبی تھا اور میں بھی نبی ہوں''۔ یہ سنتے ہی عداس آپؐ کے ہاتھ پاؤں چومنے لگا۔ ربیعہ کے بیٹوں میں سے ایک نے یہ ماجرا دیکھا تو اس نے عداس کے واپس آنے پر اسے بہت ملامت کی کہ تم یہ کیا حرکت کر رہے تھے؟ تم نے اپنا دھرم خراب کر لیا ہے۔ عداس نے جواب دیا: میرے آقا! زمین پر اس سے بڑھ کر کوئی بھلا انسان نہیں۔ اس شخص نے مجھے ایک ایسی بات بتائی ہے جسے نبی کے سوا کوئی اور نہیں جان سکتا۔

حضرت عداس رضی اللہ عنہ طائف کے پہلے شخص تھے جنہوں نے نہ صرف اسلام قبول کیا' بلکہ نبی اکرم ﷺ کے اُس سخت ترین دن میں آپؐ کی خدمت کی اور پھر ساری عمر اپنے اسلام پر ڈٹے رہے۔ روایات میں آتا ہے کہ غزوۂ بدر کے موقع پر جب عداس کے مالک عتبہ اور شیبہ مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کے لیے جانے لگے تو حضرت عداس نے اُن کو ہر ممکن روکنے کی کوشش کی اور اُن کے پاؤں پکڑ کر کہا کہ وہ اللہ کے رسول ہیں' اُن کے مقابلے میں نہ جاؤ' ورنہ راندۂ درگاہ ہو جاؤ گے—— اب اُس باغ کی جگہ ایک مسجد بنا دی گئی ہے جس کا نام ''مسجد عداس'' ہے۔

ملک الجبال کی آمد اور رحمۃ للعالمین ﷺ کی رحمت

طائف سے واپسی پر جب اوباش لڑکوں نے نبی اکرم ﷺ پر پتھراؤ شروع کیا تو حضرت زید بن حارثہ آپ ﷺ کو بچاتے ہوئے کافی زخمی ہو گئے اور ان کے سر سے کئی مقامات پر خون بہنے لگا۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت زید نے نبی اکرم ﷺ سے اہل طائف کے لیے بددعا کرنے کو کہا۔ اس موقع پر حضرت جبرائیل علیہ السلام ملک الجبال (پہاڑوں کے فرشتہ) کے ساتھ آئے —— آگے کا حال نبی اکرم ﷺ کے الفاظ (کی ترجمانی) میں ملاحظہ ہو۔ آپؐ نے فرمایا:

''..... پھر میں رنجیدہ ہو کر سیدھا چلا۔ ابھی میں ہوش میں نہ آیا تھا کہ قِران الثعالب میں پہنچا۔ میں نے اپنا سر اٹھایا تو بادل کے ایک ٹکڑے کو اپنے اوپر سایہ فگن پایا۔ میں نے دیکھا تو اس میں جبرائیل علیہ السلام تھے' انہوں نے مجھے آواز دی اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے

آپ ﷺ سے آپؐ کی قوم کی گفتگو اور ان کا جواب سن لیا ہے۔ اب پہاڑوں کے فرشتہ کو آپؐ کے پاس بھیجا ہے تاکہ آپؐ ایسے کافروں کے بارے میں جو چاہیں حکم دیں۔ (آپؐ نے فرمایا:) پھر مجھے پہاڑوں کے فرشتہ نے آواز دی' سلام کیا اور کہا: اے محمد ﷺ! یہ سب کچھ آپؐ کی مرضی پر منحصر ہے۔ اگر آپؐ چاہیں تو میں اخشبین نامی دو پہاڑوں کو ان کافروں پر لا کر رکھ دوں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((بَلْ اَرْجُوْا اَنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ مِنْ اَصْلَابِهِمْ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ وَلَا يُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا)) (صحیح البخاری)

''(نہیں!) بلکہ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کافروں کی نسل سے ایسے لوگ پیدا کرے گا جو صرف اُسی کی عبادت کریں گے اور اس کے ساتھ بالکل شرک نہ کریں گے۔''

چنانچہ نبی اکرم ﷺ کی یہ دعا پوری ہوئی اور فتح مکہ کے بعد جب قبولِ اسلام کی لہر چلی تو طائف کے لوگوں کے دلوں میں بھی اسلام نے اپنا گھر کر لیا۔ غزوۂ حنین کے بعد سب سے پہلے قبیلہ بنی ثقیف کے سردار عروہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا۔ پھر اس کے بعد آہستہ آہستہ باقی لوگ بھی اسلام کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے۔

اس ضمن میں ہمارے لیے یہ بات بڑی قابل توجہ ہے کہ سرزمین پاک و ہند پر اسلام کی ہدایت کا سورج جو پہلی مرتبہ طلوع ہوا تو اس کا سبب بننے والے محمد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو ثقفی تھے' یعنی طائف کے قبیلہ بنو ثقیف سے تعلق رکھتے تھے۔

طائف سے واپسی پر جنّوں کا ایمان لانا

طائف سے واپسی پر نبی اکرم ﷺ نے چند دن وادیٔ نخلہ میں قیام فرمایا۔ اس دوران حق تعالیٰ نے آپؐ کے پاس جنوں کی ایک جماعت بھیجی جنہوں نے قرآن مجید کو سنا' ایمان لائے اور پھر اپنے لوگوں میں جا کر اسلام کی تبلیغ بھی کی۔ جنوں نے اسلام کی تبلیغ انتہائی خوصورت الفاظ اور پیرائے میں کی۔ اس حوالے سے سورۃ الاحقاف میں فرمایا گیا:

﴿وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ﴿٢٩﴾ قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٣٠﴾ يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ

وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۱﴾ وَمَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ وَلَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءُ ۭ اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۲﴾

''اور (یاد کرو) جب ہم نے جنوں کی ایک جماعت کو آپ کی طرف متوجہ کیا تاکہ وہ قرآن سنیں۔ پس جب وہ اس جگہ پہنچ گئے تو آپس میں کہنے لگے: خاموش ہو جاؤ! پھر جب وہ پڑھا جا چکا تو اپنی قوم کو خبردار کرنے کے لیے واپس پلٹ گئے۔ کہنے لگے: اے ہماری قوم! بے شک ہم نے وہ کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے' جو سچے دین اور صراط مستقیم کی طرف رہبری کرتی ہے۔ اے ہماری قوم! داعی الی اللہ کی بات مانو اور اس پر ایمان لاؤ تاکہ اللہ تمہارے گناہ معاف فرما دے اور تمہیں عذابِ الیم سے پناہ دے۔ اور جو شخص اللہ کے داعی کا کہا نہ مانے گا تو وہ زمین میں (اللہ کو) عاجز کرنے والا نہیں' اور اس کے لیے اس کے سوا کوئی مددگار نہ ہوں گے۔ یہی لوگ کھلی گمراہی میں ہیں۔''

مطعم بن عدی کے تحفّظ میں مکہ واپسی

وادیٔ نخلہ میں چند دن قیام کے بعد نبی اکرم ﷺ مکہ کے لیے روانہ ہوئے اور شہر کے قریب کوہِ حرا کے دامن میں ٹھہر گئے۔ جب نبی اکرم ﷺ طائف کے لیے نکلے تھے تو کفارِ مکہ نبی اکرم ﷺ کے قتل کے منصوبے بنا رہے تھے۔ اس لیے نبی اکرم ﷺ نے فوراً مکہ میں داخل ہونے کے بجائے مکہ سے باہر قیام فرمایا اور بنوخزاعہ کے ایک آدمی کے ذریعے پہلے بنوزہرہ کے سردار اخنس بن شریق اور پھر بنی عامر کے سہیل بن عمرو کو پیغام بھیجا کہ وہ آپؐ کو پناہ دے' مگر دونوں نے آپ ﷺ کو پناہ دینے سے معذرت کر لی۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے مطعم بن عدی کے پاس پیغام بھیجا۔ مطعم نے اثبات میں جواب دیا اور پھر ہتھیار پہن کر اپنے بیٹوں اور قوم کے لوگوں کو بلایا اور کہا: تم لوگ ہتھیار باندھ کر خانہ کعبہ کے گوشوں پر جمع ہو جاؤ کیونکہ میں نے محمد (ﷺ) کو پناہ دی ہے۔ اس کے بعد مطعم اونٹ پر سوار ہو کر حرم کے پاس کھڑا ہو گیا اور اس نے اعلان کیا: قریش کے لوگو! میں نے محمد (ﷺ) کو پناہ دے دی ہے' اب انہیں کوئی تنگ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے ہمراہ مطعم بن عدی کے تحفظ میں مکہ تشریف لائے اور مسجد حرام میں داخل ہو کر سیدھے حجر اسود کے پاس پہنچے اور اسے بوسہ دیا۔ پھر دو رکعت نماز پڑھی اور اپنے گھر پلٹ آئے۔ اس دوران مطعم بن عدی اور اس کے

بیٹوں نے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر آپؐ کے گرد حلقہ باندھے رکھا جب تک کہ آپؐ اپنے مکان کے اندر تشریف نہیں لے گئے۔

رسول اللہ ﷺ نے مطعم بن عدی کے اس حسن سلوک کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ چنانچہ بدر میں جب کفار کی ایک بڑی تعداد قید ہو کر آئی اور بعض قیدیوں کی رہائی کے لیے حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن کی رہائی کے لیے سفارش کی تو آپؐ نے فرمایا: ''اگر مطعم بن عدی زندہ ہوتا اور وہ مجھ سے ان بدبو دار لوگوں کے بارے میں سفارش کرتا تو میں اس کی خاطر ان سب کو چھوڑ دیتا۔''

یومِ طائف: نویدِ سحر

یومِ طائف اگرچہ نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا سخت ترین دن تھا' مگر یہ دن اس اعتبار سے نوید سحر بھی تھا کہ اس دن کے بعد نصرتِ خداوندی کا ظہور شروع ہو گیا۔ طائف سے واپسی پر ملک الجبال کی آمد اور پھر جنّوں کے گروہ کا قرآن سن کر ایمان لانا دراصل طلوعِ سحر کی بشارت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے فوراً بعد نبی اکرم ﷺ کو معراج سے سرفراز کیا گیا اور پھر اگلے سال بیعت عقبہ اولیٰ اور اس سے اگلے سال بیعت عقبہ ثانیہ یقینی طور پر اللہ ربّ العالمین کی طرف سے بشارت تھی۔ ان وجوہات کی بنا پر مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے یومِ طائف کو حضور ﷺ کی زندگی کا نقطۂ تغیر (turning point) قرار دیا ہے' جبکہ نعیم صدیقی نے ''محسن انسانیت'' میں اس دن کو ''نویدِ سحر'' سے تعبیر کیا ہے۔

اخذ و استفادہ

(۱) رسولِ کامل ﷺ' ڈاکٹر اسرار احمدؒ
(۲) محسن انسانیت ﷺ' نعیم صدیقیؒ
(۳) رسولِ انقلاب ﷺ کا طریق انقلاب' ڈاکٹر اسرار احمدؒ
(۴) سیرۃ المصطفیٰ ﷺ' مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا

اُسوۂ حسنہ اور اسلامی اخلاق

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

اسلام ہی کامل اور مکمل دین ہے جو قرآن وسنت کی صورت میں بنی نوعِ انسان کو دیا گیا ہے۔ چونکہ اس کا طرزِ زندگی اللہ تعالیٰ کا تعلیم کردہ اور پسندیدہ ہے اس لیے اس کے علاوہ دوسرا کوئی طریقہ نہ کامل ہے اور نہ قابل قبول۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ﴾ (آل عمران:۸۵)

''جو کوئی اسلام کے علاوہ کوئی اور دین اختیار کرے گا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔''

دین اسلام وہ ضابطۂ حیات ہے جو اللہ کا دیا ہوا ہے۔ چونکہ انسان کا پیدا کرنے والا اللہ ہے اور وہ انسان کی قوت' صلاحیت اور نفسیات کو جانتا ہے' اس لیے اسلام کے اصول ایسے نہیں جو انسانی ہمت اور طاقت کی گرفت میں نہ آ سکتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ جو معاشرہ اسلامی اخلاق وآداب کی بنیادوں پر قیام پذیر ہوگا وہ امن وامان اور خوشحالی کا گہوارہ ہوگا۔

شیطان انسان کا ازلی دشمن ہے اور وہ کبھی نہیں چاہتا کہ انسان اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ کام کر کے فلاح پا سکے۔ اس لیے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی ہوئی مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انسانوں کو گمراہ کرنے پر لگا ہوا ہے اور اپنے اس مشن کی تکمیل کے لیے وہ انسان کو طرح طرح کے سبز باغات دکھاتا ہے۔ وہ انسان کو ہر اس کام پر آمادہ کرتا ہے جس کو اختیار کر کے دُنیوی زندگی کو آسودہ بنایا جا سکتا ہے' خواہ وہ کام دوسرے افراد اور معاشرے کے لیے کتنا ہی نقصان دہ اور انسانوں کی اُخروی زندگی کو کتنا ہی بگاڑنے والا کیوں نہ ہو —— قرآن حکیم میں واضح طور پر بار بار متنبہ کیا گیا ہے کہ شیطان کا کام گمراہ کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ کا تعلیم کردہ دین اسلام ہی واحد کامیابی کا راستہ ہے۔ جو شخص شیطان کی پرفریب چالوں میں آ گیا وہ اپنی آنے والی زندگی میں ناکام ٹھہرے گا اور عذابِ الٰہی کا مستحق ہوگا۔ اور جو شیطان کے بہکاوے میں نہ

آئے گا اور زندگی خدائی تعلیمات کے مطابق گزارے گا وہ کامیاب قرار دیا جائے گا اور انعام میں ایسی خوشگوار زندگی پائے گا جس کی خوبیاں کسی طرح بھی بیان نہیں کی جا سکتیں۔ وہ زندگی جو ہر طرح کی بیماری' کوفت اور صدمات سے پاک ہوگی اور کبھی نہ ختم ہونے والی ہوگی۔

اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ زندگی کا انداز قرآن مجید میں واضح کر دیا گیا ہے اور پھر بنی نوعِ انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کے آخری رسول حضرت محمد ﷺ کی زندگی کو اُسوۂ حسنہ یعنی بہترین طرزِ حیات قرار دے دیا گیا ہے۔ یعنی آپؐ کی مثالی زندگی کو اپنا کر ہی حقیقی کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔ جس طرح قرآن مجید کی تعلیمات کو زمانے کی دست برد سے محفوظ کر دیا گیا کہ آج تک اُس میں کسی طرح کی تحریف نہیں ہو سکی' اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو بھی مشعل راہ بنا کر لوگوں کے لیے محفوظ بنا دیا گیا ہے۔ قرآن کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لیا اور فرمایا: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ (الحجر) ''بے شک ہم نے ہی یہ قرآن نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔'' دوسری طرف رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے حالات کو بھی محفوظ کر دیا گیا' مگر یہ حفاظت انسانی کاوشوں کے ذریعے قائم رکھی گئی اور فرما دیا گیا: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:۲۱) ''رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے''۔ گویا اللہ تعالیٰ نے یہ بات اپنے ذمہ لے لی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے شب وروز کے معمولات لوگوں کے سامنے رکھے گا تاکہ وہ ان کو اپنا سکیں۔ بطور مثال آنحضرت ﷺ کی زندگی کے چند ایسے واقعات بیان کیے جاتے ہیں جن کی روشنی میں سیدھا راستہ اپنانے میں کوئی ابہام نہیں رہتا۔

رسول اللہ ﷺ کی زندگی سادگی کا نمونہ تھی۔ آپؐ گھر کے کام اپنے ہاتھوں سے کر لیتے' حتیٰ کہ گھر میں جھاڑو تک دے لیتے' اپنی جوتی کو خود مرمت کر لیتے۔ کھجور کے پتوں کی بنی ہوئی چٹائی پر لیٹ جاتے جس سے بدن پر چٹائی کے نشانات پڑ جاتے۔ جب آپؐ لوگوں کے درمیان ہوتے تو باہر سے آنے والوں کو پتا نہ چلتا کہ ان میں کون رسول اللہ ﷺ ہیں' کیونکہ آپؐ اپنے لیے کوئی امتیازی نشست اختیار نہ کرتے تھے۔ بھوک برداشت کر لینا آپؐ کا معمول تھا۔ دنیا کی نعمتوں سے بھرپور استفادہ کرنا آپ کا شعار نہ تھا۔ آپؐ کے گھر میں کئی کئی دنوں تک چولہا نہ جلتا اور کھجوریں کھا کر گزارا کر لیا جاتا۔ اپنے گھر میں آرام طلبی کا سامان پسند نہ کرتے۔ دُنیوی فوائد حاصل کرنے میں ہرگز مستعد نہ ہوتے۔ انکساری کا یہ عالم تھا کہ جب

آپ تشریف لاتے تو لوگ آپ کو دیکھ کر کھڑے نہ ہوتے‘ کیونکہ آپؐ نے اس بات سے روک دیا تھا۔ کئی دفعہ ایسا بھی ہوا کہ آپؐ نے کسی صحابی کو سواری پر سوار کیا اور خود الوداع کہنے کے لیے پیدل ساتھ چلتے رہے۔ ظاہر ہے کہ سوار اصرار کرتا ہوگا مگر آپؐ نے ساتھ پیدل چلنے ہی کو اختیار کیا۔ آپؐ سواری پر سوار ہوتے تو کسی دوسرے کو بھی ساتھ سوار کر لیتے۔

مشہور تاریخی واقعہ ہے کہ غزوۂ احزاب کے موقعہ پر مدینہ کے باہر خندق کھودنا پڑی تا کہ دشمن شہر میں داخل نہ ہوسکیں۔ ہر صحابی کے ذمہ خندق کھودنے کا کام لگا دیا گیا۔ آپؐ خود بھی خندق کھودنے میں لگ گئے‘ بلکہ دوسروں سے بڑھ کر یہ کام کیا۔ گویا آرام طلبی اور امتیاز کا آپؐ کے ہاں کوئی سوال نہ تھا۔ جب سفر میں کسی جگہ پڑاؤ ہوتا تو وہاں کھانا پکانے کے لیے کام کرنا پڑتا۔ اس سلسلہ میں ہر کوئی اپنے حصے کا کام کرتا۔ ایک دفعہ ایسا ہوا تو آپؐ نے آگ جلانے کے لیے لکڑیاں اکٹھی کرنے کا کام اپنے ذمہ لیا۔ ظاہر ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپؐ کے مقام و مرتبہ اور عزت و احترام کو اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی موجودگی میں آپؐ کوئی مشقت کا کام کریں‘ مگر آپؐ پسند نہیں کرتے تھے کہ دوسرے لوگ کام کریں اور آپؐ فارغ رہیں۔ جنگ درپیش ہوتی تو آپ ﷺ کسی خیمے میں محفوظ نہ بیٹھتے بلکہ بہ نفس نفیس میدانِ جنگ میں موجود رہتے۔ جنگ اُحد میں آپؐ کے دندانِ مبارک شہید ہو گئے اور آپؐ بے ہوش ہو کر زمین پر گر گئے۔

قانون کی نگاہ میں آپ ﷺ سب کو برابر جانتے تھے اور چھوٹے بڑے‘ امیر غریب میں کوئی امتیاز روا نہ رکھتے۔ جو بھی جرم کا ارتکاب کرتا وہ سزا پاتا۔ جب ایک اونچے خاندان کی لڑکی نے چوری کی تو آپ ﷺ نے اس کو ہاتھ کاٹنے کی سزا دی۔ آپؐ کے پاس سفارش کی گئی کہ اس لڑکی کو سزا نہ دی جائے‘ کیونکہ یہ اونچے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس پر آپؐ سخت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ پہلی قومیں اسی لیے تو ہلاک ہوئیں کہ اگر کوئی غریب آدمی جرم کرتا تو سزا پاتا اور اگر کوئی بڑا آدمی جرم کرتا تو اسے چھوڑ دیا جاتا۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر (معاذ اللہ) میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔

رسول اللہ ﷺ نے بھائی چارے کا درس دیا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ﴾ (الحجرات: ۱۰) ’’مسلمان تو آپس میں بھائی بھائی ہیں‘‘۔ دو مسلمان جن کی رہائش قریب قریب ہے یا ہزاروں میل دور ہے وہ آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اخوت کا

تقاضا ہے کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا ہمدرد اور خیر خواہ ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِاَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ)) (متفق علیہ)

’’تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اپنے مسلمان بھائی کے لیے بھی وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔‘‘

گویا ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے لیے اسی طرح خیر اور نفع چاہے جس طرح وہ اپنے لیے چاہتا ہے‘ اسی طرح ہر برائی اور نقصان کو اس کے لیے ناپسند کرے جو وہ اپنے لیے پسند نہیں کرتا۔ ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ)) (صحیح البخاری)

’’مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔‘‘

گویا ایک مسلمان دوسرے مسلمان بھائیوں کو نہ تو زبان سے برا بھلا کہے اور نہ ہی ہاتھ کی طاقت کے ساتھ کسی کو دکھ دے یا نقصان پہنچائے۔

مسلمان تو آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کا بالخصوص اور ہر انسان کا بالعموم ہمدرد اور خیر خواہ ہو۔ سب سے بڑی خیر خواہی یہ ہے کہ کسی کو صراطِ مستقیم پر لے آیا جائے۔ یعنی غیر مسلموں کو نہایت اچھے طریقے سے اسلام کی دعوت دی جائے تا کہ وہ اسلام میں داخل ہو کر فلاح یافتہ ہو جائیں۔ ایک غیر مسلم نصرانی‘ مجوسی یا عیسائی مخلوق خدا کی بھلائی کے لیے رفاہِ عامہ کے کتنے ہی اچھے کام کرے وہ اللہ کے ہاں بے وزن ہوں گے۔ سورۃ الکہف میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ۝۱۰۵﴾ ’’اور ان کے واسطے قیامت کے دن ہم میزان کھڑی نہ کریں گے‘‘۔ اس لیے کہ یہ کام تو اچھے ہیں لیکن کام کرنے والا دائرۂ اسلام سے باہر ہے اور اعمال صرف اسی کے وزن دار ہوں گے جو مسلمان ہوگا۔ پس غیر مسلموں کو اسلام میں داخل کرنے کے لیے پوری ہمدردی اور دل سوزی کے ساتھ کوشش کرنی چاہیے۔ ہاں اگر کوئی غیر مسلم ہزار کوشش کے باوجود اسلام میں داخل نہ ہو تو اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور سختی نہ کی جائے‘ کیونکہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ﴾ (البقرۃ:۲۵۶) ’’دین اسلام میں (داخل کرنے کے لیے) سختی نہیں ہے۔‘‘

ایک اہم اسلامی تعلیم یہ ہے کہ دوسروں کے کام آیا جائے۔ ضرورت کے وقت دوسروں کی مدد کی جائے۔ قرآن مجید میں ان لوگوں کو عذاب سے ڈرایا گیا ہے جو ضرورت کی چیزیں

مانگنے پر انکار کرتے ہیں۔ ضرورت مند مسلمان کو استطاعت کے مطابق قرض دینا ضروری ہے اور اگر ممکن ہو تو مفلس کو قرض معاف کر دیا جائے۔ مسلمانوں کو حکم ہے کہ وہ احسان کا رویہ اپنائیں‘ خاص طور پر اپنے والدین‘ عزیز و اقارب‘ یتیموں‘ مسکینوں‘ مسافروں اور پھر تمام دوسرے مسلمانوں کے ساتھ۔ ہمدردی کا یہ رویہ صرف انسانوں کے ساتھ ہی نہیں بلکہ تمام دوسرے حیوانات اور چرند پرند کے ساتھ بھی روا رکھنے کا اسلام حکم دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جانوروں اور چرند و پرند کو ستانے یا زیادہ کام لینے اور خوراک کم دینے سے بھی روکا گیا ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ جب ایک شخص چڑیا کے بچے اٹھا لایا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ بچے جہاں سے اٹھا کر لائے ہو وہیں رکھ کر آؤ۔ اسی طرح جب آپ ﷺ نے ایک اونٹ کو کمزور و لاغر دیکھا تو اس کے مالک کو بلا کر تنبیہہ کی کہ اس کو خوراک ٹھیک دیا کرو اور کام کم لیا کرو۔

رسول اللہ ﷺ نے زندگی بھر کسی سے زیادتی کا انتقام نہیں لیا۔ اگرچہ اسلام میں نظم و ضبط قائم رکھنے کے لیے اجازت ہے کہ زیادتی کرنے والے سے انتقام لیا جائے‘ مگر معاف کر دینے کو فضیلت کا باعث بتایا گیا ہے۔ معاف کرنے کی ترغیب اس طرح دی گئی ہے کہ جو دنیا میں کسی کا قصور معاف کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کا قصور معاف کرے گا۔ اسی طرح مفلس شخص اگر قرضہ ادا نہ کر سکے تو اس کا قرضہ معاف کر دینا بھی بڑی فضیلت کا باعث ہے۔

ماں باپ اپنے بچوں کو پیار محبت سے پالتے ہیں‘ ان کی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ خود تکلیف اور مشقت برداشت کر لیتے ہیں مگر انہیں آرام اور راحت پہنچاتے ہیں۔ ماں خاص طور پر بچوں پر جان نچھاور کرتی ہے۔ جب بچے بڑے ہو جائیں تو اللہ کا حکم ہے کہ وہ بوڑھے ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کریں‘ ان کا کہنا مانیں‘ ان کی ضروریات پوری کریں۔ اگر بڑی عمر کی وجہ سے ان پر بچپنا عود کر آئے اور ان کے مزاج میں سختی آ جائے تو بھی ان کو اُف تک نہ کہیں۔ یہ بات کس قدر فطری ہے کہ جنہوں نے حد درجہ احسان کیا ہو ان پر احسان کیا جائے اور ان کو خوش رکھا جائے۔

مرد اور عورت ایک گھر کی بنیاد رکھتے ہیں‘ پھر ان کے بچے ہوتے ہیں۔ اس طرح گھر ایک ادارہ بن جاتا ہے۔ گھر کے تمام افراد کی ضروریات کو پورا کرنا مرد کی ذمہ داری ہے۔ مرد عورت کی نسبت طاقتور اور توانا ہوتا ہے اور عورت کمزور‘ اس لیے مرد کو گھر سے باہر کام کرنا اور روزی کمانا ہوتا ہے‘ جبکہ عورت گھر کے کام کاج کرتی ہے۔ عورت کا کام آسان رکھا گیا ہے اور

اس پر روزی کی تلاش کی ذمہ داری نہیں ڈالی گئی۔ اگر کوئی عورت اپنے شوہر کی رضامندی سے کوئی ملازمت وغیرہ کرتی ہے تو اس کی اپنی مرضی ہے۔ شوہر بیوی کو کمانے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ اسلام کی باقی دوسری تعلیمات کی طرح یہ طرزِ زندگی بھی بہت فطری ہے۔

مرد کو ایک وقت میں چار تک بیویاں رکھنے کی اجازت ہے‘ مگر ساری بیویوں کے ساتھ انصاف کی کڑی شرط ہے۔ اگر کوئی مرد اس شرط کو نہ نباہ سکتا ہو تو ضروری ہے کہ وہ ایک بیوی پر ہی اکتفا کرے۔ ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت اس لیے ہے کہ کوئی مرد بے راہ روی اختیار نہ کرے اور دوسری عورتوں کی طرف تشنہ نگاہ سے نہ دیکھے۔ مرد کو گھر میں انچارج بنایا گیا ہے۔ گویا بیوی شوہر کے ماتحت ہے‘ اس اعتبار سے امکان ہے کہ شوہر اپنی حیثیت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے عورت پر زیادتی کرے۔ چنانچہ شوہر کو سختی کے ساتھ حکم ہے کہ بیوی کے ساتھ ظلم و زیادتی ہرگز نہ کرے۔ اسی طرح نوکر چاکر مالک کے خدمت گار ہوتے ہیں تو مالک کو یہ اختیار نہیں کہ وہ نوکروں کو حقیر جانے اور ان کے ساتھ سختی کرے‘ بلکہ نوکر چاکروں کے بارے میں نرمی اختیار کرنے کا حکم ہے۔ حتیٰ کہ مالک کو پابند کیا گیا ہے کہ جو خود کھائے وہی ان کو کھلائے‘ اور جو خود پہنے وہی ان کو پہنائے۔

الغرض اسلام کی تمام تعلیمات‘ جو ہمیں رسول اللہ ﷺ کے اُسوۂ حسنہ سے ملتی ہیں‘ فطرت کے عین قریب ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ عشق رسول ﷺ کا دم بھرنے کا ثبوت دیتے ہوئے نبی اکرم ﷺ کی دی ہوئی تمام تعلیمات پر عمل پیرا ہوں اور خصوصیت کے ساتھ اپنے اخلاق و کردار کو اُسوۂ حسنہ کی روشنی میں ڈھالیں۔ اس سے ایک طرف تو احسن معاشرہ وجود میں آئے گا اور دوسری طرف ہم اجر و ثواب کے مستحق قرار پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح معنوں میں اُسوۂ حسنہ کو اپنانے کی توفیق عطا فرمائے‘ آمین یا ربّ العالمین!

جہاد فی سبیل اللہ
اصل حقیقت‘ اہمیت و لزوم اور مراحل و مدارج
بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جامع خطاب

نظامِ ربوبیت اور اَقسامِ ہدایت

پروفیسر عبدالعظیم جانبازؔ، سیالکوٹ

جس طرح انسان کے جسمانی وجود کی تکوین و تکمیل کے لیے نظامِ ربوبیت کے حسین وجمیل جلوے پوری آب وتاب کے ساتھ ہر جگہ اور ہر مرحلے پر کارفرما نظر آتے ہیں، یہی رنگ اور ڈھنگ انسان کے شعوری اِرتقاء کے نظام میں بھی نظر آتا ہے۔ خلّاقِ عالم کے حسنِ ربوبیت نے انسان کی جسمانی ساخت اور پرورش کی ذمہ داری نبھانے کے ساتھ ساتھ اس کی مختلف ضرورتوں کی تکمیل کے لیے اسے ایک مرحلہ وار نظامِ ہدایت سے بھی نوازا ہے، جس سے وہ اپنے ہر مرحلۂ حیات پر نہ صرف مختلف ضروریات ومقتضیات کو جانتا اور پہچانتا ہے بلکہ اُن کی تسکین وتکمیل کے لیے مختلف راستے اور وسائل بھی تلاش کرتا ہے۔ وہ جوں جوں عمر کے مختلف اَدوار طے کرتا چلا جاتا ہے اس کی ضرورتیں بدلتی چلی جاتی ہیں، اُن میں تنوّع اور توسّع کے ساتھ ساتھ مسلسل اضافہ بھی ہوتا چلا جاتا ہے۔ پہلے سے موجود طبعی ذرائع ہدایت اس کی نئی حاجات اور تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہو جاتے ہیں، سو خود بخود اگلی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے نئے دروازے کھل جاتے ہیں اور یوں انسان کا شعوری سفر اپنی منزل کی طرف جاری رہتا ہے۔ اس شعوری پرورش کی ذِمہ داری بھی ربّ کائنات نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے اور وہ اُس کا آغاز بھی زمانۂ حمل سے کر دیتا ہے۔ پھر یہ سلسلہ پیدائش کے بعد بھی ایک نظم کے تحت مختلف مراحل سے گزرتا ہوا جاری رہتا ہے۔

اللہ ربّ العالمین نے اپنے نظامِ ربوبیت کا جلوۂ کمال انسانی زندگی کو مختلف قسم کی ہدایتوں سے سرفراز فرما کر دکھایا ہے۔ اگر ماحولیاتی ضرورتیں، تقاضے اور حقائق کی نوعیتیں جدا جدا ہوں مگر ذریعۂ ہدایت اور ماہیتِ ہدایت ایک ہی ہو تو صاف ظاہر ہے کہ یہ نہ تو تقاضائے پرورش ہے اور نہ ہی روشِ بندہ پروری۔ ربّ کائنات نے نہ صرف انسان کو بلکہ ہر ذی نفس کو اس کے حسب حال ذرائع ہدایت سے نوازا ہے۔ مطالعۂ قرآن حکیم سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ہدایت بنیادی طور پر درج ذیل پانچ اَقسام پر مشتمل ہے، جب کہ آخری قسم ہدایت مزید تین صورتوں میں پائی جاتی ہے:

۱) ہدایتِ فطری (ہدایتِ وِجدانی)

مولانا شبلی نعمانی اور ابوالکلام آزاد اسے ہدایتِ وِجدانی سے تعبیر کرتے ہیں۔ بقول ابوالکلام وِجدان کی ہدایت یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں ہر مخلوق کی طبیعت میں کوئی ایسا اندرونی الہام موجود ہے جو اسے زندگی اور پرورش کی راہوں پر خود بخود لگا دیتا ہے اور وہ خارجی رہنمائی وتعلیم کی محتاج نہیں ہوتی۔ بچہ انسان کا ہو یا حیوان کا، جونہی شکمِ مادر سے باہر آتا ہے خود بخود معلوم کر لیتا ہے کہ اس کی غذا ماں کے سینے میں ہے اور جب پستان منہ میں لیتا ہے تو جانتا ہے کہ اُسے چوسنا چاہیے۔ بلی کے بچوں کو ہمیشہ دیکھتے ہیں کہ ابھی ابھی پیدا ہوئے ہیں، ان کی آنکھیں بھی نہیں کھلی ہیں لیکن ماں جوشِ محبت میں انہیں چاٹ رہی ہے، وہ اس کے سینے پر منہ مار رہے ہیں۔ یہ بچہ جس نے اس دنیا میں ابھی ابھی قدم رکھا ہے، جسے خارج کے مؤثرات نے چھوا تک نہیں، وہ کس طرح معلوم کر لیتا ہے کہ اسے پستان منہ میں لے لینا چاہئیں اور اس کی غذا کا سرچشمہ یہیں ہے؟ وہ کون سا فرشتہ ہے جو اُس وقت اس کے کان میں پھونک دیتا ہے کہ اس طرح اپنی غذا حاصل کر لے؟ یقیناً وہ فطری ہدایت کا فرشتہ ہے اور یہی وہ فطری ہدایت ہے جو حواس وادراک کی روشنی نمودار ہونے سے بھی پہلے ہر مخلوق کو اس کی پرورش وزندگی کی راہوں پر لگا دیتی ہے۔

بلاشبہ یہ ربوبیتِ الٰہی کی فطری ہدایت ہے، جس کا الہام ہر مخلوق کے اندر اپنی نمود رکھتا ہے اور جو ان پر زندگی اور پرورش کی تمام راہیں کھول دیتا ہے۔ یہ ہدایت ہر ذی نفس کی پیدائش کے ساتھ ہی عطا کر دی جاتی ہے۔ اس کا ذکر قرآنِ مجید میں اس طرح آیا ہے:

﴿رَبُّنَا الَّذِیْ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ۝۵۰﴾ (طٰہٰ)

''ہمارا ربّ وہی ہے جس نے ہر چیز کو وجود بخشا، پھر اس کی رہنمائی کی۔''

۲) ہدایتِ حسّی

ہدایت کا دوسرا مرتبہ حواس اور مدرِکاتِ حسّی کی ہدایت ہے اور وہ اس درجہ واضح ومعلوم ہے کہ تشریح کی ضرورت نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اگرچہ حیوانات اس جوہرِ دماغ سے محروم ہیں جسے فکر وعقل سے تعبیر کیا جاتا ہے، تاہم قدرت نے انہیں احساس وادراک کی وہ تمام قوتیں دے رکھی ہیں جن کی زندگی ومعیشت کے لیے ضرورت تھی اور ان کی مدد سے وہ اپنے رہنے سہنے، کھانے پینے، توالد وتناسل اور حفاظت ونگرانی کے تمام وظائف حسن وخوبی کے ساتھ انجام دیتے رہتے ہیں۔ پھر حواس وادراک کی یہ ہدایت ہر حیوان کے لیے ایک ہی طرح کی نہیں ہے

بلکہ ہر وجود کو اتنی ہی اور ویسی ہی استعداد دی ہے جتنی اور جیسی استعداد اس کے احوال وظروف کے لیے ضروری تھی۔ چیونٹی کی قوتِ شامہ نہایت دُور رس ہوتی ہے‘ اس لیے کہ اسی قوت کے ذریعے وہ اپنی غذا حاصل کر سکتی ہے۔ چیل اور عقاب کی نگاہ تیز ہوتی ہے‘ کیونکہ اگر ان کی نگاہ تیز نہ ہو تو بلندی میں اڑتے ہوئے اپنا شکار نہ دیکھ سکیں۔

یہ ہدایت جو حواسِ خمسہ کے ذریعے میسر آتی ہے‘ اس کا ذکر قرآنِ مجید ’سمع‘ و’بصر‘ کے حوالے سے یوں کرتا ہے:

﴿اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ۝۳۶﴾ (بنی اسراء یل)

’’بے شک کان‘ آنکھ اور دل‘ ان میں سے ہر ایک سے باز پُرس ہوگی۔‘‘

﴿وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ﴾ (المُلك:۲۳)

’’اور اُس نے تمہارے لیے کان‘ آنکھیں اور دل بنایا ہے۔‘‘

۳) ہدایتِ عقلی

ہدایتِ عقلی عقل اور فہم و تدبر سے میسر آتی ہے۔ اس کا ذکر قرآنِ مجید قلب‘ عقل‘ فؤاد اور تعقل و تدبر کے الفاظ میں کرتا ہے۔ چنانچہ جا بجا ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ تم غور و فکر کیوں نہیں کرتے؟

﴿اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ﴾ وہ تدبر اور بصیرت سے کام کیوں نہیں لیتے؟

۴) ہدایتِ قلبی

ہدایتِ قلبی تزکیۂ نفس کے ذریعے دِل کی صفائی اور باطنی روشنی سے میسر آتی ہے‘ اس کا ذکر قرآنِ مجید ’علم لدُنی‘ کے الفاظ میں کرتا ہے‘ جیسا کہ حضرت خضرؑ کے بارے میں فرمایا گیا:

﴿اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ۝۶۵﴾ (الکھف)

’’ہم نے اسے اپنی بارگاہ سے رحمت خاص سے نوازا تھا اور ہم نے اسے اپنا علم لدُنی (یعنی اَسرار و معارف کا الہامی علم) سکھایا تھا۔‘‘

یہاں تک ہدایت اور رہنمائی کی جتنی صورتیں بھی بیان ہوئیں سب ظنّی تھیں اور ان میں خطا کا احتمال باقی تھا‘ ان سے حاصل ہونے والا علم یقینی اور قطعی نہیں ہو سکتا۔ اس سے حاصل ہونے والے نتائج خواہ کتنے ہی صحیح کیوں نہ ہوں لیکن غلطی کا امکان پھر بھی باقی رہتا ہے‘ کیونکہ

ان میں انسانی کسب کو دخل حاصل ہے۔

۵) ہدایتِ ربانی (ہدایت بالوحی)

اس کی مزید تین قسمیں ہیں:

۱۔ ہدایتِ عامہ: (هداية الغاية)

یہ وہ یقینی ہدایت ہے جو انبیائے کرام ﷺ کو بصورتِ وحی عطا ہوتی ہے اور ان کے ذریعے وہ عام انسانوں تک پہنچائی جاتی ہے‘ اس کا ذکر قرآنِ مجید میں یوں ملتا ہے:

﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا﴾ (السجدة:۲۴)

’’اور ہم نے ان میں سے پیشوا (یعنی انبیاء) مبعوث کر دیے جو انہیں ہمارے حکم کی رہنمائی عطا کرتے ہیں۔‘‘

اسی طرح ارشاد فرمایا گیا:

﴿قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ﴾ (البقرة:۲۵۶)

’’بے شک ہدایت گمراہی سے واضح طور پر ممتاز ہو چکی ہے۔‘‘

﴿فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ (الکھف:۲۹)

’’پس جو چاہے ایمان لے آئے اور جو چاہے انکار کر دے۔‘‘

ایک اور مقام پر اس ہدایت کا ذکر یوں کیا گیا:

﴿اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝۳﴾ (الدھر)

’’بے شک ہم نے اسے سیدھی راہ دکھا دی ہے‘ اب چاہے وہ مان لے چاہے انکار کر دے۔‘‘

یہ ہدایت تمام بنی نوع انسان کے لیے ہوتی ہے‘ اس میں کسی کو امتیاز حاصل نہیں ہوتا۔ تمام انبیائے کرام ﷺ کی دعوت اسی ہدایت پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے قرآن خود کو ’’هُدًى لِّلنَّاسِ‘‘ کہتا ہے کہ یہ قرآن تمام انسانوں کے لیے ہدایت ہے۔ یعنی تمام انسانوں کو بلا امتیازِ رنگ و نسل نورِ ہدایت مہیا کرتا ہے اور ہر ایک کو جہالت و گمراہی کے اندھیروں سے نکال کر علم و ہدایت کے اجالوں کی طرف لے آتا ہے۔ یہ ہدایت ہر ایک کو زندگی کا مقصد اور منزل کا شعور عطا کرتی ہے۔ اسے ہدایت عامہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۲۔ ہدایتِ خاصہ (هِداية الطريق):

یہ ہدایتِ ربانی کا دوسرا درجہ ہے‘ جو ہدایتِ عامہ کے بعد بالخصوص اہل ایمان کو نصیب ہوتا

ہے۔ جولوگ انبیاء کی دعوت پر ایمان لانے کے بعد سعادتِ اُخروی کی منزلِ مقصود کے حصول کے لیے کوشاں ہو جاتے ہیں انہیں باری تعالیٰ اس خاص ہدایت کی دولت سے سرفراز فرماتے ہیں۔ یہ ہدایت اس راستے کی مفصل نشان دہی پر مبنی ہوتی ہے جو اصل منزل تک پہنچاتا ہے۔

اس کا ذکر قرآنِ مجید میں یوں ملتا ہے:

﴿وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ؕ﴾ (التغابن:۱۱)

''اور جو کوئی اللہ پر ایمان لے آئے وہ اس کے دل کو صحیح رہنمائی عطا کر دیتا ہے۔''

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ ۚ﴾

(یونس:۹)

''بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے انہیں ان کا رب ان کے ایمان کے باعث (جنتوں تک) پہنچا دے گا۔''

صاف ظاہر ہے کہ یہ ہدایت کا وہ مقام ہے جو صرف ایمان اور اعمالِ صالحہ کے نتیجے میں سامنے آتا ہے۔ مزید ارشاد فرمایا گیا:

﴿فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ (البقرۃ:۲۱۳)

''پھر اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو ہدایت دی۔''

﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ﴾ (العنکبوت:۶۹)

''جو لوگ ہماری راہ میں مجاہدہ کرتے ہیں ہم یقیناً ان پر اپنے راستے کھول دیتے ہیں۔''

یہ ہدایتِ عامہ سے بلند ہدایت ہے جو ہر شخص کے لیے مقرر نہیں' یہ صرف انہی لوگوں کے لیے خاص ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں مجاہدہ کرتے ہیں۔ ارشاد فرمایا گیا:

﴿وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى﴾ (محمد:۱۷)

''اور جن لوگوں نے ہدایت پائی' اللہ نے ان کی ہدایت میں مزید اضافہ کر دیا۔''

۳۔ ہدایتِ ایصال (هدايةُ الايصال):

یہ وہ آخری اور حتمی ہدایت ہے جس میں منزلِ مقصود تک کامیابی و کامرانی کے ساتھ پہنچنے کی قطعی ضمانت عطا کی جاتی ہے۔ یہ ہدایت عام اہل ایمان کے لیے بھی نہیں بلکہ صرف ان مؤمنوں کے لیے ہے جو تقویٰ کی شرائط کو پورا کرتے ہیں۔ اس میں نہ صرف منزلِ مقصود کی روشنی مہیا کی جاتی ہے اور اس کے راستے کی نشان دہی کی جاتی ہے بلکہ راہِ حق کے مسافروں کو

خیر و عافیت کے ساتھ منزلِ مقصود تک پہنچا بھی دیا جاتا ہے۔ یہ رہنمائی کی سب سے اعلیٰ صورت ہے جس کی ضمانت قرآنِ مجید کے علاوہ دنیا کی کوئی اور کتاب مہیا نہیں کر سکتی۔

اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

﴿سَيَهْدِيْهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ ۝۵﴾ (محمد)

''اللہ تعالیٰ عنقریب انہیں اپنی منزل تک پہنچائے گا اور ان کا حال سنوار دے گا۔''

اسی طرح اہل جنت اپنی منزل 'جنت' کو پا کر کہیں گے:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۫﴾ (الاعراف:۴۳)

''کل شکر اور سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جس نے ہمیں یہاں تک پہنچایا۔''

قرآنِ حکیم اپنی رہنمائی کے اس درجے کا ذکر ان الفاظ میں بھی کرتا ہے:

﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ﴾ (بنی اسراء یل:۹)

''بے شک یہ قرآن اس (منزل) کی رہنمائی کرتا ہے جو سب سے درست ہے۔''

ہدایت ایصال کے میسر آجانے کے بعد گمراہی کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔

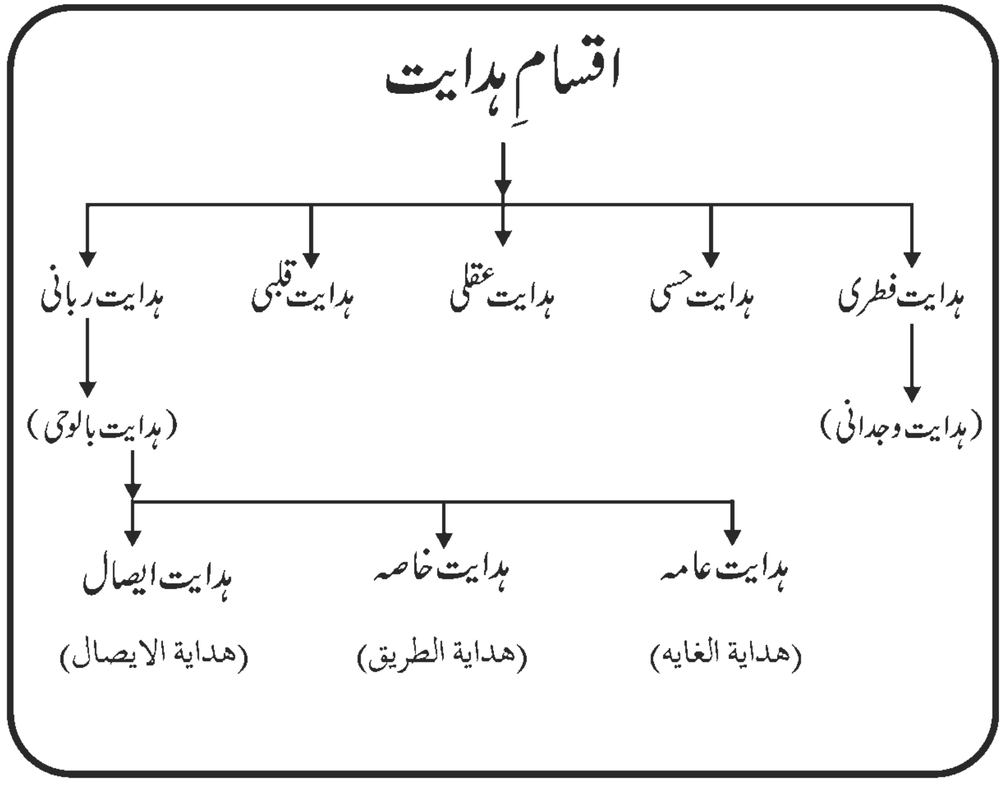

امام مسلمؒ اور ان کی ''صحیح''

عبدالرشید عراقی

مؤلفین کتب صحاحِ ستہ میں امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کا نام دوسرے نمبر پر آتا ہے۔ پہلے نمبر پر امیر المؤمنین فی الحدیث امام محمد بن اسماعیل بخاری رحمۃ اللہ علیہ (م ۲۵۶ھ) ہیں۔ امام مسلم بن حجاج القشیری خراسان کے مشہور شہر نیشاپور میں ۲۰۶ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کی کنیت ابوالحسین تھی۔ (۱)

تاریخ نیشاپور

نیشاپور عالمِ اسلام کا مشہور شہر اور خراسان کا دارالحکومت تھا۔ اسلامی افواج تیسرے خلیفۂ راشد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں یہاں داخل ہوئی تھیں۔ ۶۱۸ھ میں چنگیز خان نے اس شہر کو نیست و نابود کر دیا اور اس کے مکینوں کا قتل عام کیا۔

جب امام مسلم کی ولادت ہوئی تو نیشاپور علم و فن کا مرکز تھا۔ اُس دور میں علمِ حدیث صحابہ کرام و تابعین عظام کے سینوں سے نکل کر اکنافِ عالم میں پھیل چکا تھا۔

امام مسلم کے دور کا نیشاپور

امام مسلم کی ولادت ۲۰۶ھ میں ہوئی۔ اس وقت علم حدیث مستقل فن کی حیثیت اختیار کر چکا تھا اور ہزاروں ائمہ اور مجتہد پیدا ہو گئے تھے۔ ہر شہر اور ہر قریہ میں، جہاں اسلامی حکومت تھی، علم حدیث کا غلغلہ بلند تھا۔ اُس وقت نیشاپور کی علمی و دینی حیثیت بامِ عروج پر تھی۔ علامہ تاج الدین سبکی فرماتے ہیں: **قد كانت نيسابور من اجل البلاد واعظمها لم يكن بغداد مثلها** (۲)

''نیشاپور اس قدر بڑے اور عظیم الشان شہروں میں سے تھا کہ بغداد بھی اس کی نظیر پیش نہ کرتا تھا۔''

ابتدائی تعلیم

امام صاحب کی ابتدائی تعلیم کے حالات کچھ زیادہ نہیں ملتے۔ تاہم اس وقت خراسان اور نیشاپور میں امام اسحاق بن راہویہؒ اور امام ذہلیؒ جیسے اساطین فن موجود تھے تو آپ نے ان سے اکتسابِ فیض کیا۔ (۳)

سماعِ حدیث کے لیے سفر

۲۱۸ھ میں امام مسلم نے سماعِ حدیث کے لیے اپنے سفر کا آغاز کیا، چنانچہ آپ رے، عراق، شام، حجاز اور مصر تشریف لے گئے اور ہر جگہ اساطین حدیث سے استفادہ کیا۔ آپ کے اساتذہ و شیوخ کی تعداد کا شمار ممکن نہیں۔ تاہم آپ کے مشہور اساتذہ یہ ہیں: امام اسحاق بن راہویہ، امام ذہلی، امام یحییٰ بن یحییٰ نیشاپوری، امام احمد بن حنبل، امام عبداللہ بن مسلمہ قعنبی، امام محمد بن اسماعیل بخاری، امام سعید بن منصور، امام حرملہ بن یحییٰ (تلمیذ امام شافعی) رحمۃ اللہ علیہم۔ (۴)

امام بخاریؒ سے عقیدت و محبت

امام مسلم کو اپنے اساتذہ و شیوخ میں سے امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ سے بہت زیادہ محبت و عقیدت تھی اور ان کی شاگردی پر بہت ناز تھا۔ امام بخاری جب نیشاپور تشریف لے گئے تو امام مسلم نے ان کی خیر مقدمی کا واقعہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ امام بخاری جب نیشاپور تشریف لائے تو اس دھوم دھام سے ان کا استقبال کیا گیا جو والیانِ ملک اور سلاطین کو بھی نصیب نہ ہوا ہو گا۔ (۵)

امام بخاری کے نیشاپور کے قیام کے دوران امام مسلم نے حدیث میں استفادہ کیا۔ امام مسلم نے ایک دن بھی امام بخاری کی مجلس درس سے ناغہ نہیں کیا۔ ایک دن امام مسلم امام بخاری کی جامعیت اور تبحر علمی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ بے اختیار پیشانی کا بوسہ لے لیا اور جوش میں آ کر کہا: **دعنی اقبل رجليك يا امير المؤمنين فى الحديث** ''اے ملک حدیث کے امیر المؤمنین! مجھے اجازت دیجیے کہ میں آپ کی قدم بوسی کا شرف حاصل کروں''۔ اس کے بعد فرمایا: **اشهد انه ليس فى الدنيا مثلك** ''میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ آپ جیسا (صاحبِ علم و فضل) اس وقت دنیا میں اور کوئی نہیں۔'' (۶)

امام بخاری کی نیشاپور میں مجلس درس جاری تھی اور ان کے علاوہ امام محمد بن یحییٰ ذہلی کی مجلس درس بھی نیشاپور میں ہی ہو رہی تھی جس میں طلبہ کثرت سے جاتے تھے۔ لیکن امام محمد بن اسماعیل بخاری، امام ذہلی کی مجلس درس سے سبقت لے گئے تھے۔ انہی دنوں قرآن مجید کے کلام اللہ اور مخلوق ہونے پر علمائے کرام میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ ایک دن امام ذہلی نے اپنی مجلس درس میں فرمایا: میں کل امام محمد بن اسماعیل بخاری سے ملاقات کے لیے جا رہا ہوں، جو طالب علم میرے ساتھ جانا چاہتا ہے وہ میرے ساتھ چلے، لیکن میں اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ وہاں کوئی طالب علم امام بخاری سے کوئی اختلافی مسئلہ پوچھ بیٹھے جس کی بدولت مجھ

میں اور امام محمد بن اسماعیل بخاری میں رنجش پیدا ہو جائے اور غیر اقوام کو اہل سنت کے اختلاف پر ہنسی اڑانے کا موقع ہاتھ آ جائے۔ دوسرے دن امام ذہلی امام بخاری کی مجلس درس میں تشریف لے گئے تو اتفاقاً وہی صورت پیش آئی جس کا انہیں اندیشہ تھا۔ ایک شخص نے اٹھ کر امام بخاری سے یہ سوال کر دیا: اے ابوعبداللہ! قرآن کے جو الفاظ ہماری زبان سے نکلتے ہیں کیا وہ مخلوق ہیں؟ امام بخاری نے سکوت فرمایا۔ لیکن اس شخص نے دوبارہ اپنے سوال کو دہرایا تو امام بخاری نے فرمایا:

القرآن کلام اللّٰہ غیر مخلوق ولفظی بالقرآن الفاظنا والفاظنا من افعالنا' وافعالنا مخلوقة والامتحان منه بدعة (۷)

''قرآن کلامِ الٰہی اور غیر مخلوق ہے' اور قرآن کے جو الفاظ ہماری زبانوں سے نکلتے ہیں وہ ہمارے الفاظ ہیں' اور ہمارے الفاظ (ہماری زبان کی ایک حرکت ہونے کے باعث) ہمارا ایک فعل ہے' اور ہمارے افعال مخلوق ہیں' اور اس مسئلہ میں امتحان لینا بدعت ہے۔''

امام بخاری نے ان مختصر الفاظ میں اس بحث کا فیصلہ کر دیا تھا۔ ظاہر ہے اگر قرآن کا مفہوم نفسِ کلام سے ہے تو کلام خدا کی ایک صفت ہے' اور خدا کی صفت کیونکر مخلوق ہو سکتی ہے! اگر وہ الفاظ مراد ہیں جو ہماری حادث زبانوں سے نکلتے ہیں تو چونکہ وہ مخلوق کا ایک فعل ہے' لہٰذا ان کے مخلوق ہونے میں کلام نہیں۔ لیکن اس دقیق جواب کو عوام سمجھ نہ سکے اور انہوں نے اس واقعہ کو منفی انداز میں ہوا دی جس سے امام بخاری کی عوام میں ہر دلعزیزی میں فرق آ گیا' جسے امام صاحب نے بھی محسوس کیا' چنانچہ امام بخاری نے نیشاپور چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ امام ذہلی بھی ان لوگوں میں شامل تھے جنہوں نے اس واقعہ کو غلط انداز میں پیش کیا تھا۔ جب امام مسلم کو اس کی خبر ہوئی تو ان کو بہت رنج ہوا اور انہوں نے امام ذہلی سے اپنا سلسلہ تلمذ منقطع کر لیا۔ امام خطیب بغدادی' حافظ شمس الدین ذہبی اور حافظ ابن حجر رحمہم اللہ نے اپنی اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ امام محمد بن یحییٰ ذہلی سے جب امام بخاری کا ناگزیر قصہ پیش آیا تو باوجودیکہ تمام شہر امام صاحب سے الگ ہو گیا تھا' لیکن امام مسلم اس مسئلہ کی تہہ تک پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے امام بخاری کا ساتھ نہ چھوڑا' بلکہ امام ذہلی سے جس قدر تقریرات لکھ چکے تھے سب کو اونٹوں پر لاد کر واپس کر دیا۔ (۸)

امام مسلم مسندِ تدریس پر

امام مسلم کے تلامذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ مشہور تلامذہ حسب ذیل ہیں: امام ابوعیسیٰ

محمد بن عیسیٰ ترمذی' امام ابوحاتم رازی' امام ابراہیم بن ابی طالب' امام ابن صاعد' امام ابوحامد ابن الشرقی' امام ابوبکر بن خزیمہ' امام ابوعوانہ' امام موسیٰ بن ہارون رحمہم اللہ اجمعین (۹)

علم و فضل کا اعتراف

امام مسلم کے علم و فن کا اعتراف ان کے معاصرین و تلامذہ کے علاوہ ان کے اساتذہ نے بھی کیا ہے۔ ان کے استاد امام اسحاق بن راہویہؒ نے ان کے بارے میں فرمایا: **ای رجل یکون هذا** ''خدا جانے کس بلا کا یہ شخص ہوگا''۔ اور ان کے تلامذہ میں امام ابوحاتم رازی اور امام ابوزرعہ دونوں امام مسلم کو مخاطب کر کے فرماتے تھے: **لن یعدم الخیر ما ابقاك اللّٰه للمسلمین** ''جب تک اللہ تعالیٰ آپ کو مسلمانوں کے لیے باقی رکھے گا بھلائی آپ کے ہاتھ سے نہیں جائے گی۔'' (۱۰)

اَخلاق و عادات

امام مسلم نہایت پاکیزہ خو اور انصاف پسند تھے۔ زہد و ورع کا پیکر' عدالت و ثقاہت' فطانت و ذکاوت' شجاعت و بسالت میں اعلیٰ وارفع' پوری زندگی میں نہ کسی کی غیبت کی اور نہ سب و شتم کیا۔ اساتذہ میں امام محمد بن اسماعیل بخاری کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے۔ (۱۱)

امام مسلم کا فقہی مسلک

امام مسلم کے فقہی مسلک کے بارے میں اربابِ سیر اور تذکرہ نگاروں کی مختلف آراء ہیں۔ مولانا سید محمد انور شاہ کاشمیریؒ فرماتے ہیں کہ امام مسلم و ابن ماجہ کا مذہب معلوم نہیں ہے۔ چونکہ صحیح مسلم کے ابواب مؤلف نے بذاتِ خود قائم نہیں کیے ہیں' اس لیے ان کے مذہب کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ (۱۲)

مولانا سید نواب صدیق حسن خان نے انہیں شافعی شمار کیا ہے۔ (۱۳)

علامہ شیخ طاہر الجزائری فرماتے ہیں کہ امام مسلم کسی امام کے مقلد محض نہیں تھے' البتہ امام شافعی وغیرہ اہل حجاز کے مسلک کی طرف مائل تھے۔ (۱۴)

وفات

امام مسلم نے ۲۵ رجب ۲۶۱ھ بروز یک شنبہ نیشاپور کے باہر نصیر آباد میں وفات پائی۔ وفات کے وقت آپ کی عمر ۵۷ سال تھی۔ (۱۵)

تصانیف

امام مسلم کی تصانیف کی اجمالی فہرست پیش خدمت ہے:

صحیح مسلم، مسند کبیر، الاسماء والکنی، الجامع الکبیر، کتاب العلل، کتاب التمییز، کتاب الوحدان، کتاب الافراد، کتاب الاقران، کتاب سوالات لاحمد بن حنبل، کتاب حدیث عمرو بن شعیب، کتاب الانتفاع، باب السباع، کتاب مشائخ مالك، کتاب مشائخ ثوری، کتاب مشائخ شعبہ، کتاب لیس لہ الامر او واحد، کتاب المخضرمین، کتاب اولاد الصحابہ، کتاب اوھام المحدثین، کتاب الطبقات، کتاب افراد الشامین، کتاب رواۃ الاعتبار۔ (۱۶)

صحیح مسلم

امام مسلم کی تصانیف میں سب سے عظیم الشان ''صحیح مسلم (**المُسند الصحیح المُختصر من السنن**)'' ہے۔ سب سے پہلے امام بخاری نے احادیث صحیحہ کو یکجا کر کے صحیح بخاری کی تصنیف فرمائی۔ ان کے اس عمل کو دیکھ کر امام مسلم کا بھی ارادہ ہوا کہ اسی عنوان سے دوسرے انداز میں احادیث صحیحہ کو جمع کریں۔ امام بخاری کا مقصود تخریج احادیث صحیحہ کے ساتھ ساتھ فقہ وتفسیر اور سیرت کا استنباط بھی تھا جو ان کے تراجم ابواب سے ظاہر ہے۔ اہل درس کا مشہور مقولہ ہے کہ ''بخاری کی ساری کمائی ان کے تراجم میں ہے'' لیکن امام مسلم نے استنباط مسائل سے تعرض کیے بغیر احادیث صحیحہ اور ان کے مختلف طرق یکجا کرنے کو اپنے پیش نظر رکھا اور احادیث کو مختلف اسانید سے یکجا بیان کر دیا۔ صحیح مسلم کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ ہمیشہ صحیح بخاری کے ساتھ اس کا نام لیا جاتا ہے۔ صحیح مسلم کے حسن قبول اور اس کی جلالت شان کا اس سے پتا چلتا ہے کہ اہل اصول کا یہ ایک اصولی مسئلہ اصول کی کتابوں میں لکھا جاتا ہے:

اصح الروایات ما اتفق علیہ الشیخان ثم ما انفرد بہ البخاری ثم ما انفرد بہ مسلم (۱۷)

''صحیح ترین روایات وہ ہیں جن پر شیخین (بخاری ومسلم) کا اتفاق ہو اس کے بعد وہ جو صرف امام بخاری نے روایت کی ہوں، پھر وہ جو صرف امام مسلم نے روایت کی ہوں۔''

اہتمام تالیف

امامِ مسلم نے احادیث صحیحہ کی شناخت میں مہارتِ کاملہ رکھنے کے باوجود اپنی کتاب میں ذاتی رائے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس فن کے جلیل القدر محدثین وائمہ کرام کی آراء کو بھی پیش نظر رکھا۔ چنانچہ امام مسلم خود فرماتے ہیں: **لیس کل شیء عندی صحیح وضعتہ ھھنا انما وضعت ھھنا ما اجمعوا علیہ** یعنی میں نے اس کتاب میں ہر وہ حدیث جو میرے نزدیک صحیح ہو ذکر نہیں کی، بلکہ ان احادیث کو ذکر کیا ہے جن کی صحت پر ائمہ فن کا اجماع ہو۔ (۱۸)

زمانہ تصنیف

امام مسلم نے یہ کتاب ۱۵ برس میں تصنیف کی، جیسا کہ ان کے ایک شاگرد احمد بن مسلمہ فرماتے ہیں: **کنت مع مسلم فی تالیف صحیحہ خمس عشرۃ سنۃ** ''۱۵ برس تک میں صحیح مسلم کی ترتیب وتالیف میں امام مسلم کے ساتھ شریک رہا''۔ (۱۹)

امام مسلم کے شاگرد خاص امام ابواسحاق بن محمد بن سفیان کا بیان ہے کہ میں نے ۲۵۷ھ میں اس کتاب کی قراءت سے فراغت پائی۔ (۲۰) یعنی امام مسلم کے انتقال سے قبل یہ کتاب پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی تھی۔

تعدادِ روایات

امام مسلم فرماتے ہیں: **صنّفتُ ھذا المُسند الصحیح فی ثلاث مائۃ الف حدیث مسموعۃ** یعنی میں نے تین لاکھ احادیث میں سے ایک مسند صحیحہ کا انتخاب کیا ہے۔ (۲۱)

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ صحیح مسلم میں روایات کی تعداد شیخ ابن اصلاح اور علامہ طاہر الجزائری کے نزدیک چار ہزار ہے۔ (۲۲)

خصوصیاتِ صحیح مسلم

مجموعی طور پر صحیح بخاری کو صحت وغیرہ اور بہت سے امور میں پورے مجموعہ احادیث پر فوقیت حاصل ہے، لیکن صحیح مسلم کو بھی بعض حیثیات سے ذخیرۂ احادیث پر امتیاز ہے۔ ائمہ فن نے صحیح مسلم کی بہت سی خصوصیات بیان فرمائی ہیں۔ ذیل میں چند ایک خصوصیات پیش خدمت ہیں:

(۱) صحیح مسلم سے استفادہ بہت ہی آسان ہے۔ چونکہ امام مسلمؒ ہر حدیث کو اس کے مناسب مقام پر بیان فرماتے ہیں اور پھر اسی جگہ پر اس حدیث کے متعدد طرق اور مختلف الفاظ کو

ذکر کر دیتے ہیں بخلاف امام بخاری کے کہ وہ روایات میں تقدیم و تاخیر' حذف اور اختصار کرتے رہتے ہیں جس سے بعض مرتبہ تعقید پیدا ہو جاتی ہے۔

(۲) امام مسلم نے مختلف طُرق اور تحویلِ اسانید کو ایجاز کے ساتھ نہایت عمدہ عبارت میں پیش کیا ہے۔

(۳) صحیح مسلم کو جن حیثیتوں سے ایک بےنظیر تصنیف کا خطاب دیا گیا ہے ان میں ایک وصف اس کتاب کی طرزِ ادا اور حسن ترتیب ہے جس سے امام موصوف کے متعلق اندازہ ہوتا ہے کہ وہ علم حدیث کی باریکیوں اور اسرار سے کس قدر واقف تھے' اور اس کا صحیح اندازہ وہی لگا سکتا ہے جس کی نظر ان تمام علوم پر ہو جن کی ایک محدث کو ضرورت پڑتی ہے۔

(۴) امام مسلم اپنی کتاب میں حدیث کے پورے متن کو یکجا بیان کرتے ہیں' اس کے پورے الفاظ کو نقل کرتے ہیں اور روایت بالمعنی کی بجائے روایت باللفظ بیان فرماتے ہیں جو ان کے غایت احتیاط کی دلیل ہے اور اس کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یا بعد کے لوگوں کے اقوال کے ساتھ ضم نہیں کرتے۔ (۲۳)

کتب صحاح میں صحیح مسلم کا مقام

(۱) امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''کتاب اللہ کے بعد صحیح بخاری و مسلم کا مقام ہے اور امت اسلامیہ نے ان دونوں کتابوں کی تلقی بالقبول کی ہے۔ البتہ صحیح بخاری دیگر فوائد و معارف کے لحاظ سے فائق و ممتاز ہے۔ (۲۴)

(۲) علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے اپنی شرح ''فتح الملہم'' میں علامہ جزری کا یہ قول نقل کیا ہے:

ورجحان کتاب البخاری علی کتاب مسلم امر ثابت ادی الیہ بحث بھا بذۃ النقاد واختیارھم

یعنی صحیح بخاری کا امام مسلم کی کتاب پر من حیث الصحۃ راجح ومقدم ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اعتراف بڑے بڑے ناقدین فن نے بحث و فکر کے بعد کیا ہے۔ (۲۵)

علامہ جزری کے قول سے معلوم ہوا کہ صحیح بخاری کے بعد دوسرے درجہ پر صحیح مسلم کو رکھا گیا ہے۔

(۳) محی السنۃ مولانا سید نواب صدیق حسن خان قنوجی رئیس بھوپال تحریر فرماتے ہیں:

واقع است اجماع بر تلقی ایں ہر دو کتاب بالقبول والتسلیم زیرا کہ شیخین مقدم اند بر ائمہ عصر وما بعد در معرفت علل و غوامض ایں۔

یعنی صحیح بخاری و مسلم کی صحت پر تلقی بالقبول اور تسلیم عام حاصل ہے' کیونکہ امام بخاری و

امام مسلم اپنے زمانے اور مابعد کے ائمہ پر احادیث کے علل اور اس کی باریکیوں کی معرفت وتمیز میں سب پر مقدم وفائق تھے۔ (۲۶)

(۴) علامہ شبیر احمد عثمانی نے اپنی شرح صحیح مسلم میں حافظ ابن حجر عسقلانی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ صحیح مسلم کا مقام حسن ترتیب کے لحاظ سے بہت بلند ہے' یہاں تک کہ بعض لوگوں نے اسے صحیح بخاری پر بھی مقدم کیا ہے۔ (۲۷)

مقدمہ صحیح مسلم

امام مسلم نے اپنی تالیف (صحیح مسلم) کا ایک مقدمہ بھی تحریر فرمایا ہے۔ اس مقدمہ میں ایک طرف جرح وتعدیل اور اصولِ حدیث کے بارے میں نہایت مہتم بالشان نکات بیان کیے گئے ہیں' جبکہ دوسری طرف اس مقدمہ کی عبارت نہایت مغلق ہے اور اس مقدمہ کا اغلاق مشہور ہے۔ مولانا عبدالسلام مبارک پوری لکھتے ہیں:

''امام مسلم نے بلاتہذیب وتحریر بطریق متقدمین بلاتکلف اپنے مقصود کا اظہار فرمایا ہے' نہ تکرار مخل کا خیال مانع ہوا اور نہ ایجاز مخل کا لحاظ فرمایا۔ کہیں مبتدا بول کر جملہ معترضہ کی طویل عبارت کی خبر لاتے ہیں' کہیں صلات اور متعلقات کی تقدیم وتاخیر بے ڈھب ہے۔ غرض کیف ما اتفق اپنے مقاصد کا اظہار فرمایا ہے اور بعض اصولی مسائل میں اختلاف کیا ہے اور اس کی مثال دینے میں بڑی طوالت سے کام لیا ہے۔ اس اغلاق اور اصولی اور اہم مسائل کی وجہ سے اہل علم کی توجہ برابر مقدمہ کی شرح کی جانب مبذول رہی۔ اس وجہ سے لوگوں نے صرف مقدمہ کی شرح لکھی ہے۔ (۲۸)

مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم ومغفور لکھتے ہیں:

''مذہب اگرچہ دنیا کی تمام قوموں کو عزیز ہے' تاہم مسلمانوں نے اس کو جس عزت کی نگاہ سے دیکھا دنیا کی کوئی قوم اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ علمی حیثیت سے مسلمانوں نے سب سے پہلے جس چیز کی طرف توجہ کی وہ یہی مذہبی علوم و فنون تھے۔ ان میں نحو' ادب' تفسیر' فقہ' اصولِ فقہ' اگرچہ سب کے سب بالذات یا بالواسطہ مذہبی علوم ہیں اور اس لیے مسلمانوں نے ان سب میں کمال پیدا کیا' تاہم ان میں علم حدیث چونکہ مذہب کا سب سے زیادہ ضروری عنصر تھا اس لیے یہ مقدس فن ایک مدت تک عام طور پر مسلمانوں کے دل و دماغ کی جولانگاہ بنا رہا۔ اس عام مذاق نے اگرچہ نہایت مفید نتائج پیدا کیے' تاہم چونکہ مذہبی حیثیت سے یہ گروہ نہایت عزت کی نگاہ سے

دیکھا جاتا تھا اس لیے نااہل اور خودغرض لوگوں کی ایک بہت بڑی جماعت نے اس فن کو محض نام ونمود کا ذریعہ قرار دے کر موضوع اور غیر معتبر روایتوں کا ایک طوفان اٹھادیا''۔ (۲۹)

امام مسلم نے اپنے مقدمہ میں ضعیف اور موضوع احادیث کا رد کیا ہے۔ امام صاحب ضعیف راویوں کا استقصا کر کے لکھتے ہیں:

''ہمارا خیال ہے ان مجہول الاسناد اور ضعیف روایتوں پر جن کو ہم نے بیان کر دیا ہے ان کے ضعف کے ظاہر ہونے بعد بجز ان لوگوں کے جن کو عوام کے نزدیک کثرت سے حدیثیں بیان کرنے کا شوق ہوتا ہے تاکہ یہ کہا جائے کہ فلاں نے کس کثرت سے حدیثیں جمع کی ہیں' اکثر لوگ اعتبار نہ کریں گے۔ لیکن جو لوگ علم حدیث میں یہ مسلک اختیار کرتے ہیں ان کو اس فن میں ذرا بھی دخل نہیں اور ان کو بجائے عالم کے جاہل کہنا اچھا ہے۔'' (۳۰)

اس عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں محض شہرت کے لیے ہر قسم کی ربط و یا بس حدیثوں کے روایت کرنے کا مذاق پیدا ہو چکا تھا۔

صحیح مسلم کی شروح

صحیح مسلم کے ساتھ محدثین کرام نے بہت اعتنا کیا ہے۔ اس کی بہت سی شروح' تعلیقات' مستخرجات' اختصار وحواشی لکھے گئے ہیں۔ صاحبِ کشف الظنون نے ان کا مفصل تذکرہ کیا ہے۔ مولانا عبدالسلام مبارک پوریؒ نے ۳۱ شروح ومستخرجات' تعلیقات اور مختصرات کا ذکر کیا ہے۔ (۳۱) مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم نے ۸ مشہور شروح کے نام اپنی کتاب تذکرۃ المحدثین میں درج کیے ہیں۔ (۳۲) مولانا تقی الدین ندوی مظاہری نے ۱۴ شروح وتعلیقات اور مستخرجات ومختصرات کا ذکر کیا ہے۔ (۳۳) مولانا سلیم اللہ خان' شیخ الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی نے ۱۸ شروح کا ذکر کیا ہے۔ (۳۴) ذیل میں چند مشہور شروح کا تعارف پیش خدمت ہے:

(۱) **المنہاج فی شرح صحیح مسلم بن حجاج** : یہ شرح امام یحییٰ بن شرف نوویؒ (م ۶۷۶ھ) کی تصنیف ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں:

''اگر لوگوں کی ہمتیں پست نہ ہوتیں اور شائقین کی کمی نہ ہوتی تو میں اس شرح کو ایک سو جلدوں میں مکمل کرتا' لیکن میں نے توسط ہی اقتصار کیا۔ یہ اب صرف تین جلدوں میں ہے۔'' (۳۵)

(۲) **اِکمالُ المُعلم فی شرح مسلم** : یہ شرح مشہور امام قاضی عیاض مالکی (م ۵۴۴ھ) کی ہے اور امام نوویؒ کی شرح کا دراصل یہی ماخذ ہے۔

(۳) **اکمال اکمال المُعلِم** : یہ شرح امام ابوعبداللہ محمد بن خلفہ (م ۸۲۷ھ) کی تالیف ہے۔ یہ ایک ضخیم شرح ہے چار جلدوں میں۔ مصنف نے لکھا ہے کہ اس میں قاضی عیاض' امام نووی' قرطبی' مازری' ان چاروں شروح سے مدد لی ہے' اور بہت سے فوائد اضافہ کیے ہیں اور اپنے شیخ محمد بن عرفہ کے فوائد بڑھائے ہیں۔ شیخ الحدیث مولانا ابوالحسن علی عبیداللہ رحمانی فرماتے ہیں: ''ان کی یہ شرح ابوعبداللہ محمد بن محمد بن یوسف سنوسی (م ۸۹۵ھ) کی شرح مکمل اکمال الاکمال کے ساتھ دارالکتب العلمیہ بیروت سے طبع ہو چکی ہے۔'' (۳۶)

(۴) **الدیباج علی صحیح مسلم بن حجاج** : یہ شرح علامہ جلال الدین عبدالرحمٰن بن علی سیوطی (م ۹۱۱ھ) کی تالیف ہے۔ اس شرح کے بارے میں مولانا عبدالسلام مبارک پوری لکھتے ہیں: ''ایک عمدہ شرح ہے۔ ابتدا میں چند فصلیں ہیں' جن میں صحیح مسلم کے شروط اور ان کی اصطلاحات' اور جن کنیتوں اور القابات واسماء میں اشتباہ واقع ہو سکتا تھا' اس کا رفع کیا ہے۔ الفاظِ غریبہ واعراب مشکلہ کا حل' تناقضات کا رفع' اختلافاتِ روایات کا بیان' اوہام کا ایضاح' غرض استنباطِ مسائل کی ساری باتیں موجود ہیں۔

مولانا عبدالسلام مبارک پوری کے صاحبزادہ مولانا عبیداللہ رحمانی مبارک پوری فرماتے ہیں کہ میرے پاس کتب خانہ مصری کے نسخے کا عکس موجود ہے اور یہ کتاب طبع ہو چکی ہے۔ (۳۷)

(۵) **مختصر صحیح مسلم** : یہ شرح امام ذکی الدین عبدالعظیم منذری (م ۶۵۶ھ) کی تصنیف ہے۔ یہ مختصر صحیح مسلم محدث شہیر شیخ محمد ناصر الدین البانی کی تحقیق سے وزارۃ الاوقاف والشؤن الاسلامیہ حکومت کویت نے ۱۳۸۹ھ میں طبع کی ہے۔ (۳۸)

(۶) **شرح مختصر صحیح مسلم** : یہ مختصر علامہ محمد بن احمد الاسنوری (م ۷۶۳ھ) کی شرح ہے۔ (شرح مختصر صحیح مسلم للمنذری کی دو شرحیں لکھی گئیں) (۳۹)

(۷) **السراج الوھاج من کشف مطالب صحیح مسلم بن حجاج** : یہ شرح مختصر صحیح مسلم للمنذری کی تیسری شرح ہے اور مولانا سید نواب صدیق حسن خاں (م ۱۳۰۷ھ) کی تصنیف ہے۔ یہ دو جلدوں میں ہے۔ اس شرح میں امام نووی کی شرح ''المنہاج'' سے بھی استفادہ کیا گیا ہے اور بعض مقامات پر ''قُلْتُ'' کہہ کر اپنی رائے بھی ظاہر کی ہے۔ (۴۰)

(۸) **فتح الملہم** : یہ شرح مولانا شبیر احمد عثمانی (م ۱۳۶۹ھ) کی تالیف ہے۔ اس کے آغاز میں ایک جامع وعلمی اور تحقیقی مقدمہ ہے جس میں علم حدیث کے اصول وضوابط اور کتاب کی

خصوصیات سے بحث کی گئی ہے۔ نیز شرح میں خصوصیت سے اسرارِ حدیث کی طرف خاص توجہ مبذول فرمائی ہے۔ مولانا عثمانیؒ نے اس کی صرف تین جلدیں لکھیں، اس کے بعد ملکی سیاست میں دلچسپی لینے لگے، جس کی وجہ سے وہ اس شرح کی تکمیل نہ کر سکے۔ مولانا محمد تقی عثمانی دیوبندی نے اس شرح کی تکمیل ''تکملة فتح الملهم'' کے نام سے کی ہے۔ یہ شرح مع تکملہ مطبوع ہے۔

(۹) **تلخیص صحیح مسلم** : ضیاء الدین ابوالعباس احمد بن عمر القرطبی (م ۶۵۶ھ)

(۱۰) **التعلیق علی الصحیح المسلم** : مولانا عبدالجلیل سامردوی (م ۱۳۹۲ھ)

(۱۱) **حاشیه صحیح مسلم** : مولانا عبدالسلام مدنی:

شروح مقدمہ صحیح مسلم

(۱۱) **البحر المواج فی شرح مقدمة الصحیح لمسلم بن الحجاج** : یہ کتاب مقدمہ صحیح مسلم کی شرح ہے اور استاذ الاساتذہ مولانا حافظ عبداللہ محدث نمازی (م ۱۳۳۷ھ) کی تصنیف ہے۔ اس میں مشکل الفاظ کی تشریح کرتے ہوئے راویوں کے سلسلہ میں امام مسلم کے خیالات کی پوری وضاحت کی گئی ہے۔ (۴۱)

(۱۲) **النجم الوهاج فی شرح مقدمة الصحیح لمسلم بن الحجاج** : یہ مقدمہ صحیح مسلم کی شرح ہے اور علامہ ابوالطیب شمس الحق عظیم آبادی (م ۱۳۲۹ھ) صاحب عون المعبود فی شرح سنن ابی داؤد کی تالیف ہے۔ یہ دونوں شروح (نمبر ۱۱، ۱۲) بہت طویل ہیں، لیکن غیر مطبوع ہیں۔ (۴۲)

اردو تراجم

(۱۳) صحیح مسلم کے اردو میں کئی علمائے کرام نے تراجم کیے ہیں جو سب کے سب مطبوع ہیں۔ سب سے قدیم اور مفید ترجمہ مولانا وحید الزمان حیدر آبادی (م ۱۳۳۸ھ) کا ہے، اس ترجمہ کا نام مولانا وحید الزمان نے ''**المُعلم ترجمة صحیح مسلم**'' رکھا ہے۔ یہ ترجمہ پہلی مرتبہ مطبع صدیقی لاہور سے ۱۳۰۴ھ تا ۱۳۰۶ھ شائع ہوا۔ اس کے بعد یہ ترجمہ کئی ناشروں نے شائع کیا ہے۔

(۱۴) **ترجمه صحیح مسلم** (پارہ اول): مولانا عبدالعزیز مدنی فرخ آبادی (م ۱۳۴۱ھ)

(۱۵) **انعام المُنعم بترجمة الصحیح لمسلم** : مولانا سید عبدالاول غزنوی (م ۱۳۳۱ھ)

(۱۶) **ترجمه و شرح مولانا محمد داؤد راز دهلوی** (م ۱۴۰۲ھ) : (نامکمل)

(۱۷) **شرح صحیح مسلم** (اردو): صحیح مسلم کی یہ شرح مشہور دیوبندی عالم دین مولانا عبدالقیوم حقانی حفظہ اللہ کی تصنیف ہے۔ مولانا عبدالقیوم حقانی کا پاکستان کے دیوبندی علماء میں ایک مرتبہ و مقام ہے۔ آپ کہنہ مشق مصنف اور بلند مرتبہ مدرس ہیں۔ ان کی تصانیف کی تعداد ایک سو سے متجاوز ہے۔ یہ شرح ابھی مکمل نہیں ہوئی۔ مولانا حقانی حفظہ اللہ اس شرح کی تکمیل میں شب و روز مصروف ہیں۔ مولانا حقانی نے اپنی اس شرح کا تعارف درج ذیل الفاظ میں کرایا ہے:

> ''حدیث کی جلیل القدر کتاب ''صحیح مسلم'' کی سہل ترین دلنشین تشریح، حدیث اور فقہ کے علمی مباحث، مشکل لغات کی توضیح، مؤلف (حقانی) کی ۳۵ سالہ علمی، تحقیقی، مطالعاتی زندگی اور تدریسی تجربات کا نچوڑ، بیسیوں شروحات کے مطالعہ کا انتخاب، مقدمہ کتاب الایمان تین اور راویان صحیح مسلم دو جلدیں زیر طبع ہیں۔'' (۴۳)

(۱۸) **کشف المهلم عما فی مقدمة مسلم** (اردو) : یہ کتاب مقدمہ صحیح مسلم کا اردو ترجمہ ہے اور مترجم کا اسم گرامی مولانا عبدالسلام بستوی (م ۱۳۹۴ھ) ہے۔ ترجمہ سلیس اردو زبان میں کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ مشکل الفاظ کی لغوی تشریح کی گئی ہے۔ ۵۴ صفحات پر مشتمل یہ کتابچہ محبوب المطابع دہلی سے پہلی بار ۱۳۵۶ھ میں شائع ہوا۔ (۴۴)

حواشی

(۱) تذکرۃ الحفاظ، ج ۲، ص ۱۶۵ (۲) طبقات الشافعیہ، ج ۱، ص ۱۷۳

(۳) سیر اعلام النبلاء، ج ۱۲، ص ۵۵۸ (۴) تاریخ، ج ۱۳، ص ۱۰۰

(۵) مقدمہ فتح الباری، ص ۴۹۱ (۶) مقدمہ فتح الباری، ص ۴۸۵

(۷) مقدمہ فتح الباری، ص ۴۹۱

(۸) تاریخ بغداد، ج ۱۳، ص ۱۰۳۔ تذکرۃ الحفاظ، ج ۲، ص ۵۸۹۔ مقدمہ فتح الباری، ص ۴۹۱

(۹) تذکرۃ المحدثین، ج ۱، ص ۲۲۸

(۱۰) تذکرۃ الحفاظ، ج ۲، ص ۱۶۵۔ تہذیب التہذیب، ج ۱۰، ص ۱۲۷

(۱۱) بستان المحدثین، ص ۱۱۷ (۱۲) فیض الباری، ج ۱، ص ۱۸۳

(۱۳) المختصر فی ذکر الصحاح الستۃ، ص ۹۸ (۱۴) توجیہ النظر، ص ۱۸۵

(۱۵) تاریخ ابن خلکان، ج ۲، ص ۱۳۶ (۱۶) مقدمہ فتح الملہم، ص ۱۰۰

(۱۷) مقدمہ ابن الصلاح، ص ۱۳

(۱۸) صحیح مسلم، کتاب الصلوۃ، باب التشہد، ج ۱، ص ۴۱۷

(۱۹) سیر اعلام النبلاء، ج ۱۲، ص ۵۶۶ (۲۰) فوائد جامعہ برعجالہ نافعہ، ص ۶۷ (باقی صفحہ 98 پر)

بقیہ: عرضِ احوال

(۴) مذاکرات میں باوقار انداز اختیار کیا جائے‘ قبائلی روایات کو مدنظر رکھا جائے۔ مذاکرات آئین پاکستان کے تحت ہی ہونے چاہئیں۔ لیکن یاد رہے کہ اس آئین میں یہ درج ہے کہ کوئی قانون سازی قرآن وسنت کے خلاف نہیں ہوسکتی اور قراردادِ مقاصد بھی آئین کا حصہ ہے۔ لہٰذا فوری طور پر وہ اقدام کیے جائیں جن کی روک تھام کے لیے پہلے ہی قوانین موجود ہیں‘ مثلاً فحاشی اور بے حیائی کے اظہار اور اس کی تشہیر کے حوالہ سے قانون پر سختی سے عمل درآمد کیا جائے۔ شراب نوشی اور جوا کی کسی آسمانی مذہب میں اجازت نہیں‘ لہٰذا ان غیر اسلامی افعال پر پابندی لگائی جائے۔

(۵) ڈرون حملوں میں اگر کسی بھی سطح پر پاکستان تعاون کر رہا ہے تو اسے علی الاعلان بند کیا جائے اور امریکہ کو ان حملوں سے باز رکھنے کی انتہائی سنجیدہ کوشش کی جائے۔

(۶) افغانستان سے پاکستان کی طرف ہونے والی دراندازی کو پوری مستعدی سے روکا جائے اور سفارتی سطح پر بھارت کے ساتھ یہ مسئلہ اٹھایا جائے کہ وہ افغانستان میں اپنے وہ قونصل خانے بند کردے‘ جو دہشت گردی کے ٹریننگ کیمپ قائم کیے ہوئے ہیں۔ اس حوالہ سے دنیا بھر میں بھرپور انداز میں آواز اٹھائی جائے۔

(۷) پاکستان کی کل سات خفیہ ایجنسیاں ہیں۔ حالات اور واقعات شاہد ہیں کہ ان میں باہم رابطہ نہیں ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ایک ایسا ادارہ یا کم از کم کوئی ڈیسک قائم کیا جائے جو ان کے درمیان ارتباط (co-ordination) کا کام کرے، تاکہ کسی ایک خفیہ ایجنسی کی کسی غیر مصدقہ اطلاع پر حکومت کارروائی نہ کر بیٹھے اور امن کو نقصان پہنچ جائے۔

(۸) حکومت اس مسئلہ کے حل کے لیے علماء سے مضبوط رابطہ قائم کرے‘ خصوصاً علمائے دیوبند کی خدمات حاصل کی جائیں۔ مذاکرات کے حوالہ سے ان سے بھرپور مشاورت کی جائے اور انہیں مذاکراتی ٹیم کا حصہ بھی بنایا جائے۔

(۹) تاریخی پس منظر کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ جس طرح افغانستان کی تاریخ بتاتی ہے کہ وہاں بیرونی حملہ آور کبھی اپنا قبضہ مستحکم نہ کر سکا‘ اسی طرح پاکستان کی چھیاسٹھ سالہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ یہاں کبھی فوجی آپریشن مثبت نتائج پیدا نہ کر سکا۔

(۱۰) آخری اور اہم ترین بات یہ ہے کہ انتہائی خلوص اور نیک نیتی سے مذاکرات کیے جائیں۔ اگر حکومتی ذہن میں کسی سطح پر بھی یہ خیال موجود ہوا کہ مذاکرات کر کے آپریشن سے پہلے عوامی حمایت حاصل کر لی جائے یا آپریشن کو جواز فراہم کرنے کے لیے مذاکرات مفید رہیں گے یا

ان لوگوں کا منہ بند کرنا مقصود ہو جو طالبانِ پاکستان سے مذاکرات پر اصرار کر رہے ہیں تو ایسی صورت میں یہ بدنیتی تباہ کن ثابت ہوگی۔

درج بالا اقدام کیے جائیں گے تو یقیناً وہ طالبان جن کی جدوجہد خالصتاً اسلام کے حوالہ سے ہے اور ان کا پاکستان دشمن قوتوں سے کوئی رابطہ نہیں‘ وہ محاذ آرائی ختم کر دیں گے۔ اس صورت میں مذاکرات میں حکومت پاکستان یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہوگی کہ اب وہ حکومت کے ساتھ مل کر ان لوگوں کا مقابلہ کریں جو پاکستان کے شہریوں اور سیکیورٹی اہلکاروں پر حملے کر رہے ہیں یا جنہیں غیر ملکی خفیہ ایجنسیوں کی سرپرستی حاصل ہے اور وہ محض پاکستان کو غیر مستحکم کرنا چاہتے ہیں۔

حکومت پاکستان کو اس بات پر یقیناً غور کرنا ہوگا کہ اگر طالبانِ پاکستان صرف یہ مطالبہ کر دیں کہ آئین پاکستان میں جو اسلامی شقیں ہیں ان پر عمل درآمد کیا جائے‘ علاوہ ازیں اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات پر آئین کے مطابق عمل کیا جائے تو حکومت پاکستان کے پاس کیا جواب ہوگا؟ اس لیے کہ آئین پاکستان کے حوالے سے ہمارا موجودہ طرز عمل خود آئین کی حرمت کو پامال کرنے کا موجب بن رہا ہے! ❁❁❁

بقیہ: امام مسلمؒ اور ان کی صحیح

(۲۱) مقدمہ نووی‘ ص ۱۳
(۲۲) مقدمہ فتح الملہم‘ ص ۹
(۲۳) محدثین عظام اور ان کے علمی کارنامے‘ ص ۱۷۱ تا ۱۷۹
(۲۴) مقدمہ صحیح مسلم نووی‘ ص ۱۳
(۲۵) فتح الملہم (مقدمہ)‘ ص ۹۶
(۲۶) اتحاف النبلاء‘ ص ۴۰
(۲۷) فتح الملہم‘ ص ۹۹
(۲۸) سیرت البخاری‘ (صدی ایڈیشن)‘ ص ۴۴۹
(۲۹) تذکرۃ المحدثین‘ ج ۱‘ ص ۲۳۴‘ ۲۳۵
(۳۰) مقدمہ صحیح مسلم
(۳۱) سیرت البخاری‘ (صدی ایڈیشن)‘ ص ۴۵۱ تا ۴۵۸
(۳۲) تذکرۃ المحدثین‘ ج ۱‘ ص ۲۶۱۔
(۳۳) محدثین عظام اور ان کے علمی کارنامے‘ ص ۱۷۸‘ ۱۸۸
(۳۴) محدثین عظام اور ان کی کتابوں کا تعارف‘ ص ۱۰۰
(۳۵) مقدمہ نووی‘ ص ۵
(۳۶) سیرت البخاری (صدی ایڈیشن) ص ۴۵۳
(۳۷) ایضاً‘ ص ۴۵۴
(۳۸) ایضاً‘ ص ۴۵۶
(۳۹) ایضاً‘ ص ۴۵۷
(۴۰) جماعت اہلحدیث کی تصنیفی خدمات‘ ص ۳۸
(۴۱) ایضاً‘ ص ۵۴
(۴۲) سیرت البخاری (صدی ایڈیشن) ص ۴۵۰
(۴۳) ماہنامہ القاسم اکتوبر ۲۰۱۳ (ص ۲)
(۴۴) جماعت اہلحدیث کی تصنیفی خدمات‘ ص ۶۳

سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے دلپذیر موضوع پر

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے فکر کا نچوڑ

سیرتِ خیر الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام

سیرت طیبہ پر ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے آخری خطابات کا مجموعہ

جو قبل ازیں قسط وار ہفت روزہ ندائے خلافت کے صفحات کی زینت بن چکا ہے

اب کتابی صورت میں چھپ کر آ گیا ہے

- عمدہ طباعت
- دیدہ زیب ٹائٹل
- صفحات: 240
- قیمت: 180 روپے

خود مطالعہ کیجئے
دوستوں کو تحفتاً پیش کیجئے

ملنے کا پتہ

مکتبہ خدام القرآن لاہور

قرآن اکیڈمی، 36 کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 03-(042)35869501

فیکس: (042)35834000 ای میل: maktaba@tanzeem.org

ویب سائٹ: www.tanzeem.org

Jan. 2014
Regd. CPL No. 115
vol. 63
No.1